سورۃ بنی اسرائیل

نام:

اس سورت کا نام بنی اسرائیل ہے اور اسرا بھی اس کا نام آیا ہے اور اس میں 12 رکوع اور 111 آیتیں ہیں۔ بنی اسرائیل کے ذکر سے ہی یہ سورت شروع ہوتی ہے اور انہی کے ذکر پر ختم ہوتی ہے اور اس کی پہلی ہی آیت میں یہ اشارہ کر دیا گیا ہے کہ وہ سب برکات جو بنی اسرائیل کو دی گئیں ان کا وارث بھی اب نبی کریم ﷺ کو کیا جاتا ہے۔ اور سورت کے تیسرے اور چوتھے رکوع میں پندرہ آیتوں میں توریت کی ساری تعلیم سے بڑھ کر مکمل اور بلند تر اخلاق کی تعلیم اکٹھی کر دی گئی ہے اور سورت کے آخری رکوع میں پھر شریعت موسوی کا ذکر کیا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خاص طور پر بنی اسرائیل یعنی یہود کو خطاب ہے۔ اس لحاظ سے اس سورت کا نام بنی اسرائیل ہے۔ اور اس کے نام اسرا میں اشارہ کمالاتِ محمدیہ کی طرف ہے جن پر آپ کا معراج جس کا ذکر سورت کی ابتدا اور پھر درمیان میں موجود ہے، دلالت کرتا ہے۔

خلاصہ مضمون:

① سورت کی ابتدا نبی کریم ﷺ کے معراج سے کی ہے۔ مگر معراج کا ذکر ایسے رنگ میں کیا ہے جس میں مسجد اقصیٰ کا ذکر لا کر بتا دیا ہے کہ وہ برکات جو مسجد اقصیٰ یعنی بیت المقدس سے تعلق رکھتی تھیں اور جن کے ساتھ بنی اسرائیل کو مخصوص کیا گیا تھا ان کا وارث اب نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت کو کیا جاتا ہے اور معراج نبوی میں گویا عروج اسلام کا ذکر کر کے مضمون کا انتقال فوراً بنی اسرائیل کے دو مرتبہ فساد عظیم کرنے اور ان پر دو مرتبہ سزا آنے کا ذکر پہلے رکوع میں کیا ہے۔ اور اس میں اگر ایک طرف بنی اسرائیل کو سمجھانا مقصود ہے تو دوسری طرف مسلمانوں کو بھی تنبیہ کرنا مقصود ہے۔ اس لیے رکوع کے آخر میں قرآن کا ذکر کر کے بتایا کہ یہ پاک کتاب تمہیں نہایت ہی مضبوط راہ پر چلاتی ہے۔

② دوسرے رکوع میں بتایا کہ اعلیٰ اغراض زندگی کو چھوڑنے اور صرف دنیا پر گر جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں بھی قوموں پر بربادی اور تباہی آ جاتی ہے۔ اور اسی ضمن میں بتایا کہ انسان کا ہر عمل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے اور یہ نتائج یہاں انسان کی نظر سے مخفی رہتے ہیں اور قیامت میں یہ کھل کر سامنے آ جاتے ہیں۔ ہاں دنیا میں جب کوئی قوم حد سے تجاوز کرتی ہے تو یہ نتائج کھلا رنگ اختیار کر کے سامنے آ جاتے ہیں۔

③،④ تیسرے اور چوتھے رکوع میں اخلاق فاضلہ کی تعلیم دی ہے اور یوں بتایا ہے کہ یہی اعلیٰ اغراض زندگی ہیں جن کی طرف انسان کو متوجہ ہونا چاہیے۔ اور اسی تعلیم میں توریت کی بھی ساری تعلیم آ گئی ہے اور نہایت عجیب تقسیم کر کے تیسرے رکوع میں دوسروں

سے نیکی کی تعلیم ہے اور چوتھے میں دوسروں سے بدی کرنے سے روکا ہے۔

⑤ پانچویں رکوع میں توحید کے مضمون کی طرف رجوع کر کے جس سے اخلاق فاضلہ کا مضمون شروع کیا تھا ایمان بالآخرہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کیونکہ بغیر اس کے اخلاق فاضلہ حاصل نہیں ہو سکتے کہ اعمال کی جزا وسزا پر پورا پورا یقین ہو۔

⑥ چھٹے رکوع میں اسی قانون جزا وسزا کے ذکر کو جاری رکھتے ہوئے عذاب الٰہی کے آنے کا قانون بیان کیا اور

⑦ ساتویں میں مخالفین نبی کریم ﷺ پر عذاب کا ذکر کیا۔

⑧ آٹھویں رکوع میں ان کوششوں کا ذکر ہے جو رسول اللہ ﷺ کے خلاف کی جاتی تھیں۔ دکھوں اور تکلیفوں کے بعد آپ کو بادشاہت اور دولت کا لالچ دینا اور بالآخر آپ کے قتل کا منصوبہ اور

⑨ نویں میں حق کی کامیابی کی عظیم الشان بشارت دی اور بتایا کہ باطل یعنی بت پرستی اس ملک عرب سے ایسی دور ہوگی کہ پھر دوبارہ نہ آئے گی۔ اور ضمناً سمجھا دیا کہ دنیا میں روز بروز توحید کا غلبہ ہوتا چلا جائے گا۔

⑩ دسویں میں قرآن کریم کے اعجاز عظیم کا ذکر کیا اور یہ بھی بتایا کہ ظاہر پرست مخالفین ظاہری کامیابی اور مال و دولت کو ہی معیار صداقت ٹھہرانے میں غلطی پر ہیں۔

⑪ گیارہویں میں انکار رسول اور اس کی سزا کا ذکر کر کے

⑫ بارہویں میں پھر شریعت موسوی اور اس کی صداقت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے شریعت محمدیہ اور اس کی حقانیت کا ذکر کیا اور آخر میں سلسلہ بنی اسرائیل کے آخری نبی یعنی حضرت مسیح کے متعلق جو غلط فہمی عقیدۂ ابنیت مسیح سے پیدا ہوئی اس کی طرف توجہ دلا کر مضمون کا انتقال عیسائیت کی طرف کیا جس کا ذکر اگلی سورت میں ہے۔

تعلق:

خلاصہ مضمون سے ظاہر ہے کہ اس سورت کا مضمون پچھلی سورتوں سے الگ رنگ کا ہے کیونکہ یہاں بالخصوص خطاب بنی اسرائیل کو ہے۔ لیکن بایں ہمہ پچھلی سورت کے ساتھ اس کا تعلق نہایت واضح ہے۔ اول تو اس طرح پر کہ پچھلی سورت کا خاتمہ اس بات پر کیا تھا کہ مسلمان ایک بڑی قوم بنیں گے۔ تو اس سورت کی ابتدا نبی کریم ﷺ کے معراج سے کر کے اسی عروج اسلام کی طرف توجہ دلائی اور دوسرے اس طرح پر کہ سورت نحل کے آخر پر فرمایا تھا کہ اہل کتاب کو حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ حق کی طرف بلاؤ۔ تو اب یہاں اہل کتاب کے پہلے گروہ یعنی یہود کو خطاب کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح ان کا دنیا پر جھک جانا ان کی تباہی کا موجب ہوا۔ اس لیے اب بھی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور حق کو قبول کریں اور اسی طرح سورۂ کہف میں عیسائیوں کو خطاب کیا ہے۔

زمانۂ نزول:

اس سورت کے زمانۂ نزول کے متعلق سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے صریح روایت ہے کہ پہلے زمانہ کی نازل شدہ ہیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل، الکہف، مریم، طٰہٰ، الانبیاء کے متعلق آپ نے فرمایا [إِنَّهُنَّ مِنَ الْعِتَاقِ الأُوَلِ وَهُنَّ مِنْ تِلاَدِي.] (صحيح البخاری، كتاب التفسير، باب 1، حديث: 4708) یعنی یہ وہ سورتیں ہیں جو ابتدا میں مکہ میں نازل ہوئیں اور یہ ان میں سے ہیں جو انہوں نے پہلے پہلے قرآن کریم سے سیکھا۔ پس اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ابتدائی زمانہ مکہ کی سورتیں ہیں اور اس کی تائید دو اور باتوں سے ہوتی ہے۔ اول یہ کہ اس سورت میں یقیناً معراج کا ذکر ہے اور سورت النجم میں بھی یہ ذکر ہے اور سورت النجم بالاتفاق ابتدائی زمانہ کی ہے۔ اس لیے یہ سورت جس میں معراج کا ذکر ہے اسی زمانہ کی ہونی چاہیے۔ اور دوسرے یہ کہ سورت مریم جسے اس سورت کے ساتھ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک ہی زمانہ کی قرار دیا ہے وہ حصہ قرآن کریم کا ہے جسے حبش کی پہلی ہجرت کے وقت سیدنا جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے نجاشی کے سامنے پڑھا اور وہ پانچواں سال بعثت کا تھا۔ اور ایسا ہی سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے وقت طٰہٰ نازل شدہ تھی اور اسی سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ پر بھی اثر ہوا تھا۔ پس اگر ہم مکی زمانہ کی تقسیم یوں کریں کہ ابتدائی زمانہ پہلے سے پانچویں سال بعثت تک اور درمیانی زمانہ چھٹے سے دسویں سال بعثت تک اور آخری زمانہ ہجرت تک قرار دیں تو یہ بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سورت کے نزول کی ابتدا ابتدائی مکی زمانہ سے تعلق رکھتی ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ بعض آیات کا نزول پیچھے ہوا ہو اور یہ جو بعض لوگوں نے دو یا چار یا پانچ یا آٹھ آیتوں کو مدنی کہا ہے تو یہ درست نہیں۔ مثلاً آیت ﴿وَ اِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ﴾ [73] ﴿وَ اِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ﴾ [76] قریباً قریباً چھٹے سال بعثت کے واقعات میں سے ہیں اور انہیں مدنی کہنا غلطی ہے اور آیت ﴿وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ﴾ [80] بطور پیشگوئی کے ہے یا ممکن ہے ہجرت کے بالکل قریب کی ہو۔ لیکن مدنی یہ نہیں۔

اٰیَاتُھَا 111 (17) سُوْرَۃُ بَنِیْٓ اِسْرَاۗءِیْلَ مَکِّیَّۃٌ (50) رُکُوْعَاتُھَا 12

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ①

وہ ذات پاک ہے جو ایک رات اپنے بندے (محمد) کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف لے گیا جس کے ارد گرد کو ہم نے بابرکت بنایا، تاکہ ہم اسے اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔(1801)

1801 - ﴿الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا﴾ اَقْصٰی۔ قَصٰی بمعنی بُعُدَ یعنی دوری سے ہے [دیکھو نمبر: 1233]۔ اور ﴿الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا﴾ کے لفظی معنی ہوئے دور کی مسجد اور مسجد اقصیٰ بیت المقدس کو کہا ہے بوجہ اس فاصلہ کے جو نبی کریم ﷺ کی جائے قیام یعنی حجاز اور بیت المقدس میں تھا۔ (غ) اور بعض نے بُعُدَ سے پلیدیوں اور ناپاکیوں سے دور ہونا مراد لیا ہے۔ (ر) اور ہر دو معنی کے لحاظ سے مسجد نبوی کو جو مدینہ میں ہے مسجد اقصیٰ کہا جا سکتا ہے۔ مگر احادیث میں مسجد اقصیٰ کا لفظ بیت المقدس پر ہی بولا گیا ہے۔

بٰرَكْنَا۔ بَارَكَ کے معنی اسے برکت دی اور بَرَكَةٌ کسی چیز میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھلائی کا رکھا جانا ہے کیونکہ بِرْكَةٌ حوض کو کہتے ہیں جس میں پانی ٹھہرتا ہے۔ گویا اس چیز میں الٰہی خیر اسی طرح ٹھہر گئی جس طرح پانی حوض میں ٹھہر جاتا ہے۔ (غ) اور یہاں بٰرَكْنَا سے مراد دینی اور دنیوی بھلائیوں کا جمع کر دینا ہے۔ کیونکہ وہ سرزمین بوجہ اپنی انہار و اشجار کے دنیوی طور پر بھی بھلائیوں کی جگہ ہے۔ جس طرح بوجہ انبیاء کا مقام ہونے کے دینی طور پر بھلائیوں کی جگہ ہے۔

حَوْلَ۔ اصل معنی کسی چیز کا تغیر ہیں، [دیکھو نمبر: 720]۔ اور سال کو کہتے ہیں اس لیے کہ اس میں ایک دورہ بلحاظ نظام شمسی پورا ہوتا ہے ﴿حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ [البقرۃ: 233:2] ''پورے دو سال۔'' اور کسی چیز کے اردگرد کو بھی حَوْلَ کہا جاتا ہے۔ گویا یہ اس کی وہ جانب ہے جس کی طرف اسے پھیرا جا سکتا ہے۔ (غ) اور یہاں یہی مراد ہے۔

آیت اسراء اور احادیث معراج:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے نبی کریم ﷺ کو رات کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کو لے جانے کا ذکر ہے اور مفسرین نے اس سے مراد معراج لیا ہے۔ کیونکہ حدیث معراج میں نبی کریم ﷺ کو پہلے بیت المقدس میں لے جانے کا ذکر ہے۔ احادیث اس بارہ میں بہت ہیں اور ان میں سے صحیح بھی ہیں، حسن بھی ہیں اور ضعیف بھی۔ اور ان میں بہت سے اختلافات بھی ہیں۔ یہاں تک کہ انہی اختلافات کی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ معراج کئی بار ہوا ہے ایک بار نہیں۔ مگر کثیر صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس

روایت کا پایا جانا اور سب میں ایک ہی معراج کا ذکر پایا جانا صاف بتاتا ہے کہ واقعہ تو صحیح ہے اور ہے بھی ایک لیکن بوجہ نوعیت قصہ کے اس میں راویوں سے بہت اختلاف ہو گیا ہے۔ خلاصہ احادیث معراج کا یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ پہلے بیت المقدس میں تشریف لے گئے اور پھر سب آسمانوں کی سیر آپ کو کرائی گئی۔ یہاں تک کہ آپ ان تمام مقامات سے اوپر نکل گئے جہاں تک دوسرے انبیاء علیہم السلام پہنچے تھے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پانچ نمازوں کا فرض ہونا بھی واقعہ معراج سے ہی متعلق ہے۔ اس بارہ میں سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ آیا معراج جسد عنصری کے ساتھ تھا یا نہیں۔ اور اس بارہ میں امت میں دو گروہ ہوئے ہیں۔ کثیر گروہ اسے جسم عنصری کے ساتھ مانتا ہے اور قلیل گروہ جن میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، سیدنا معاویہ اور سیدنا حسن رضی اللہ عنہما ہیں اسے رؤیا مانتا ہے۔ ابن کثیر نے اس پر بحث کرتے ہوئے ابن اسحاق کے الفاظ نقل کیے ہیں [فَاللّٰهُ أَعْلَمُ أَيْ ذٰلِكَ كَانَ قَدْ جَاءَهُ وَعَايِنُ مِنَ اللّٰهِ فِيْهِ مَا عَايِنُ أَيْ حَالَةٌ كَانَ نَائِمًا أَوْ يَقْظَانِ كُلُّ ذٰلِكَ حَقٌّ وَصِدْقٌ] (ابن کثیر، جلد5، صفحہ 44) یعنی اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ معراج جسم عنصری کے ساتھ تھا یا بغیر اس کے۔ ہاں آپ اللہ کے حضور گئے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو دیکھنا تھا دیکھا، خواہ وہ کسی حالت میں ہوں یعنی سوتے یا جاگتے یہ سب حق وصدق ہے۔ اور یہی بات اقرب الی الصواب ہے۔ مگر آج اس بات پر تعجب ہے کہ صرف اس بات کے کہنے کی وجہ سے کہ معراج روحانی تھا تکفیر تک نوبت پہنچائی جاتی ہے۔

جن لوگوں نے معراج کو جسمانی مانا ہے ان کے دلائل حسب ذیل ہیں۔ اول یہ کہ اسے ایک عظیم الشان واقعہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی ابتدا ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ﴾ سے ہوتی ہے۔ دوم یہ کہ اگر جسمانی نہ ہوتا تو کفار قریش تکذیب کیوں کرتے۔ سوم یہ کہ بعض مسلمان اس بات کو سن کر مرتد بھی ہو گئے تھے۔ چہارم یہ کہ لفظ عَبْد مجموعہ جسم وروح سے عبارت ہے۔ ان میں سے پہلی بات تو چنداں قابل توجہ نہیں۔ معراج روحانی بھی ہو تو اس کی عظمت کم نہیں ہو جاتی۔ عظمت تو اس لحاظ سے ہے کہ آنحضرت ﷺ کو تمام انبیاء سے بلند تر مقام پر پہنچایا گیا۔ دوسری بات کہ کفار تکذیب نہ کرتے۔ یہ بھی کوئی مضبوط دلیل نہیں۔ اس لیے کہ کفار تو آنحضرت ﷺ پر وحی آنے کی بھی تکذیب کرتے تھے اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا جواب بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جب آپ کے سامنے ذکر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا [إِنِّيْ أُصَدِّقُهُ عَلٰى اَبْعَدِ مِنْ ذٰلِكَ أُصَدِّقُهُ عَلٰى خَبَرِ السَّمَآءِ غَدْوَةً أَوْرَوْحَةً] (تفسیر آلوسی، جلد10، صفحہ355) میں تو اس سے بھی زیادہ بعید از قیاس بات پر آپ کی تصدیق کرتا ہوں میں تو آپ کو اس میں بھی سچا مانتا ہوں کہ صبح شام آپ پر آسمان سے خبر آتی ہے۔ تیسری بات کہ بعض مسلمان مرتد ہو گئے تھے صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ کوئی خاص نام کسی حدیث میں میری نظر سے نہیں گزرا کہ معراج کے واقعہ پر وہ مرتد ہو گیا ہو۔ صرف یہی عام الفاظ بعض روایات میں ہیں کہ بعض لوگ مرتد ہو گئے تھے۔ مگر ابوسفیان والی حدیث اس کی تردید کرتی ہے۔ جہاں قیصر کے اس سوال کے جواب میں کہ کوئی مسلمان مرتد ہوتا ہے۔ ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے یہ جواب دیا۔ حالانکہ وہ اس وقت مسلمان بھی نہ تھا کہ دین سے ناراض ہو کر کوئی مرتد نہیں ہوتا۔ اور چوتھی بات بہت ہی کمزور ہے۔ کیونکہ رؤیا میں جو کچھ انسان دیکھتا ہے وہ گو اس جسد عنصری سے نہ ہو مگر روح کو ایک اور جسم مل جاتا ہے اور حالت کشفی میں بھی جو رؤیا سے زیادہ صفائی کی حالت ہے ایک اور نورانی جسم عطا ہوتا ہے جس کے ساتھ انسان کسی دوسرے عالم کی اشیاء کو دیکھتا ہے۔ حضرت

ابراہیم علیہ السلام کہتے ہیں ﴿اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ﴾ یہ دیکھنے والا بھی تو روح مع الجسد ہی ہے۔مگر وہ جسم جو رؤیا اور کشف میں ملتا ہے یہ جسم عنصری نہیں ہوتا۔ یہ جہاں ہو وہیں رہتا ہے اور انسان کہیں کا کہیں ہو آتا ہے۔لوگ چونکہ انبیاء علیہم السلام کے رؤیا کو بھی اپنے خوابوں کی طرح سمجھتے ہیں اس لیے خیال کرتے ہیں کہ رؤیا کے نیچے حقیقت ہی کیا ہے۔

معراج کے جسد عنصری کے ساتھ نہ ہونے کے دلائل:

غور کیا جائے تو خود قرآن شریف سے اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح مذہب وہی ہے جس کی طرف قلت گئی ہے۔یعنی یہ کہ

1. معراج نبوی اس جسد عنصری سے نہیں بلکہ دوسرے نورانی جسم کے ساتھ تھا جو اللہ تعالیٰ حالت کشف میں اپنے برگزیدوں کو عالم روحانی کی سیر کے لیے عطا فرماتا ہے۔قرآن کریم میں پہلی دلیل تو خود یہ موجود ہے کہ اسی سورت میں معراج کا ذکر کر کے فرمایا ﴿وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ﴾[60] جہاں صاف الفاظ میں اسے رؤیا کہا ہے اور رؤیا کا لفظ عالم خواب سے مخصوص ہے جس میں جسد عنصری حرکت نہیں کرتا۔[وَالرُّؤْيَا مَا يُرٰى فِي الْمَنَامِ] (غ) رؤیا وہ ہے جو خواب میں دیکھا جاتا ہے۔

2. دوم: جب کفار نے جسد عنصری کے ساتھ اوپر جانے کا مطالبہ کیا ﴿اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ﴾[93] تو اس کا جواب دیا ﴿قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا﴾[93] گویا یہ تقاضائے بشریت کے خلاف ہے کہ انسان اس جسد عنصری کے ساتھ اس زمین کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلا جائے۔جیسا کہ دوسری جگہ ہے ﴿اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ۝ اَحْيَآءً وَّ اَمْوَاتًا ۝﴾[المرسلات: 77:25-26] ''کیا ہم نے زمین کو سمیٹ لینے والی نہیں بنایا؟ (کیا) زندوں کو اور (کیا) مُردوں کو۔''

3. سوم: حدیث بخاری میں صاف یہ لفظ ہیں [فِيمَا يَرَىٰ قَلْبُهُ تَنَامُ عَيْنُهُ وَلَا يَنَامُ قَلْبُهُ.] (السنن الكبرى للبيهقي، كتاب النكاح، باب كَانَ يَنَامُ وَلاَ يَتَوَضَّأُ، حديث: 13770) یعنی اس حالت میں معراج ہوا جب آپ کا قلب دیکھتا تھا اور آپ کی آنکھ سوتی تھی۔مگر دل نہیں سوتا تھا اور اسی حدیث کے آخر میں یہ لفظ ہیں [وَاسْتَيْقَظَ وَهُوَ فِي مَسْجِدِ الْحَرَامِ.] (صحيح البخاري، كتاب التوحيد، باب قَوْلِهِ وَكَلَّمَ اللهُ مُوسٰى تَكْلِيمًا، حديث: 7517) پھر آپ جاگ اٹھے اور آپ مسجد حرام میں تھے۔جس سے صاف ثابت ہوا کہ یہ سب کچھ آپ پر حالت خواب میں وارد ہوا۔اور دوسری روایت میں جو وہ بھی بخاری کی ہے معراج کی حالت کو [بَيْنَ النَّائِمِ وَالْيَقْظَانِ] (صحيح البخاري، كتاب بدء الخلق، باب ذِكْرِ الْمَلاَئِكَةِ، حديث: 3207) یعنی سوتے اور جاگتے کے درمیان یا حالت مکاشفہ قرار دیا ہے۔اور مطلب دونوں کا ایک ہی ہے۔

4. چہارم: جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج میں دیکھا اس کا اسی زمین پر حالت کشف یا رؤیا میں دیکھنا ثابت ہے۔

(۱) اول بیت المقدس۔حدیث میں ہے کہ جب کفار نے آپ کی بات کو نہ مانا اور بیت المقدس کے حالات دریافت کیے تو اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو آپ کے سامنے کر دیا یعنی کشفی حالات میں اور آپ نے ان کو سب کچھ بتا دیا

[قُمْتُ فِي الْحِجْرِ، فَجَلاَ اللهُ لِي بَيْتَ الْمَقْدِسِ ،فَطَفِقْتُ أُخْبِرُهُمْ عَنْ آيَاتِهِ وَأَنَا أَنْظُرُ إِلَيْهِ.] (صحيح البخاری، کتاب مناقب الانصار، باب حَدِيثِ الإِسْرَاءِ، حديث:3886) میں حجر میں کھڑا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو میرے سامنے کر دیا تو میں انہیں اس کی نشانیوں سے خبر دینے لگا درآنحالیکہ میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

﴿۲﴾ دوسرا جنت و نار۔ حدیث کسوف میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھے اس جگہ سب کچھ دکھا دیا گیا یہاں تک کہ بہشت اور دوزخ بھی اور یہ اس وقت کا ذکر ہے جب آپ نماز کسوف پڑھا رہے تھے۔ چنانچہ بخاری ابواب الکسوف میں حدیث اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما میں یہ لفظ ہیں [قَالَ: "مَا مِنْ شَيْءٍ كُنْتُ لَمْ أَرَهُ إِلَّا قَدْ رَأَيْتُهُ فِي مَقَامِي هٰذَا حَتَّى الْجَنَّةِ وَالنَّارِ".] (صحيح البخاری، کتاب الوضوء، باب مَنْ لَمْ يَتَوَضَّأْ إِلاَّ مِنَ الْغَشْيِ الْمُثْقِلِ، حديث: 184) یعنی کوئی چیز نہیں جسے میں نے نہیں دیکھا تھا مگر وہ مجھے اس مقام پر یعنی نماز پڑھتے پڑھتے دکھا دی گئی۔ یہاں تک کہ بہشت اور دوزخ بھی دکھا دیئے گئے۔

﴿۳﴾ تیسرا اللہ تعالیٰ کا جس طرح معراج میں ﴿دَنَا فَتَدَلّٰى﴾ کا نظارہ ہوا اسی طرح احمد اور ترمذی کی روایت میں ہے جسے حدیث صحیح کہا گیا ہے جو معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے اپنے رب کو احسن صورت میں دیکھا اور یہ اسی زمین کا ذکر ہے [إِنِّي قُمْتُ مِنْ اللَّيْلِ فَصَلَّيْتُ ..... فَإِذَا أَنَا بِرَبِّي عَزَّ وَجَلَّ فِي أَحْسَنِ صُورَةٍ ..... فَرَأَيْتُهُ وَضَعَ كَفَّهُ بَيْنَ كَتِفَيَّ حَتَّى وَجَدْتُ بَرْدَ أَنَامِلِهِ بَيْنَ صَدْرِي.] (مسند أحمد، جلد36، صفحه 423,422) یعنی میں رات کے وقت اٹھا اور نماز پڑھی ۔۔۔۔تب ناگہاں میں نے اپنے رب کو احسن صورت میں دیکھا۔۔۔تب میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ میرے کندھوں کے درمیان رکھا یہاں تک کہ میں نے اس کی انگلیوں کی ٹھنڈک اپنے سینہ میں پائی۔ تو جب اللہ تعالیٰ کو، جنت و نار کو، بیت المقدس کو مکہ یا مدینہ میں دیکھ لیا تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ یہ نظارے اسی دنیا میں دکھا دیا کرتا ہے۔ اور ان کے لیے نقل مکانی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہاں اللہ تعالیٰ کو یہ بھی قدرت ہے کہ وہ ایک انسان کو اٹھا کر لے جائے۔ یہاں تک کہ جنت دکھا دے اور یہ بھی کہ جنت کو اٹھا کر لائے یہاں تک کہ ایک انسان کو دکھا دے۔ دونوں صورتوں میں قدرت میں کوئی فرق نہیں اور نہ اس سے قدرت میں کچھ فرق آتا ہے کہ ایک چیز اپنی جگہ پر بھی ہو اور اللہ تعالیٰ اس کا تمثل دوسری جگہ بھی دکھا دے۔

یہاں معراج کی ایک غرض بھی بتائی ہے ﴿لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا﴾ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج اس غرض کے لیے تھا کہ آپ کو کچھ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں دکھائی جائیں۔ گویا جو باتیں آپ کو معراج میں دکھائی گئیں وہ کسی دوسری حقیقت کے لیے بطور نشان بھی تھیں اور درحقیقت معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات غیر متناہی کا نقشہ کھینچا ہے اور یہ بتایا ہے کہ آپ اس بلند ترین مقام پر پہنچے ہوئے ہیں جہاں کوئی دوسرا انسان یا فرشتہ نہیں پہنچا۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس اسرا میں اشارہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی طرف ہو خواہ اقصیٰ سے مراد مدینہ کو لیا جائے اور اس مسجد کو جو اس میں بننے والی تھی۔ جہاں سے برکات اسلام دنیا میں پھیلنی

وَ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْكِتٰبَ وَ جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَكِیْلًا ۝۲

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت ٹھہرایا کہ میرے سوائے کسی کو کارساز نہ بناؤ۔ (1802)

تھیں اور خواہ مسجد اقصیٰ سے مراد بیت المقدس ہو مگر الیٰ غایت کے لیے نہ ہو اور حدیث معراج کی بعض روایتوں میں یہ آتا ہے کہ آپ نے پہلی منزل پر نماز مدینہ میں پڑھی اور دوسری منزل پر بیت المقدس میں۔

واقعہ اسراء میں یعنی آنحضرت ﷺ کے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف لے جائے جانے میں یہ اشارہ ہے کہ بیت المقدس جو انبیائے بنی اسرائیل کا مقام تھا آنحضرت ﷺ کے متبعین کو دے دیا جائے گا۔ کیونکہ یہود یا عیسائیوں میں وہ لوگ نہ رہے تھے جو اس پاک سرزمین کے وارث قرار دیئے جاتے اور بموجب وعدہ خداوندی بھی ضروری تھا کہ ابراہیم کی اولاد کی دوسری شاخ اب اس پاک سرزمین کی مالک ہوتی۔ پس اصل اشارہ اس طرف ہے کہ انبیائے بنی اسرائیل کی برکات کا وارث بھی اب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو کیا جاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ معراج میں کل انبیاء کا آپ کی اقتدا میں بیت المقدس میں نماز پڑھنا دکھایا گیا اور قرآن شریف میں معراج کا ذکر صرف اسی قدر ہے جو یہاں ہوا یعنی بیت المقدس کو لے جانے کا ذکر۔ آسمانوں پر لے جانے کا ذکر نہیں۔ جس سے اسی بات کی تائید ہوتی ہے کہ یہاں بیت المقدس کے آنحضرت ﷺ کو دیا جانے اور انبیائے سابق کی تمام برکات کا وارث کیا جانے کی طرف ہی خاص اشارہ ہے اور اس کی تائید آیت کے آخری الفاظ سے ہوتی ہے جن میں اللہ تعالیٰ کی صفات سمع و بصر کا خاص ذکر کیا گیا ہے۔ گویا بتایا ہے کہ وہ خدا جو مخلوق کی باتوں کو سنتا ہے اور ان کے اعمال کو دیکھتا ہے اسی کا یہ کام ہے کہ اب ان تمام برکات کا وارث ایک دوسری قوم کو بناتا ہے اور اسی کی مزید تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ آگے ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اور اس کے بعد بنی اسرائیل کے فساد فی الارض کا ہے اور ﴿هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ﴾ میں بعض نے ضمیر آنحضرت ﷺ کی طرف لی ہے۔ مگر اس صورت میں مراد صرف اس قدر ہوگی کہ آپ سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے کلام کو سننے والے اور سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کو دیکھنے والے ہیں۔ مگر چونکہ اَلسَّمِیْعُ اور اَلْبَصِیْرُ اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں اس لیے هُوَ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لینی چاہیے۔

معراج کب ہوا؟ عام خیال یہ ہے کہ معراج دسویں یا گیارہویں سال بعثت کا واقعہ ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ غلط ہے۔ اس سورت کے زمانہ نزول کی بحث میں میں نے دکھایا ہے کہ یہ چوتھے یا پانچویں سال کی سورت ہے اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی شہادت اس پر صریح ہے اور اس میں معراج کا ذکر آنا خود بتاتا ہے کہ معراج اس سے پہلے کا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ شہادت موجود ہے کہ سورت النجم میں بھی معراج کا ذکر ہے اور وہ اس سے بھی پہلے کی ہے۔

1802 - **تعلیم توحید کی غرض:** اس سورت میں یہود کی حالت کی طرف بالخصوص توجہ دلائی ہے اور یہ سب سے پہلے اور آخری رکوع کے مضمون سے صاف ظاہر ہے جس طرح اس سے اگلی سورت میں عیسائیت کا نقشہ کھینچا ہے اور پہلی آیت میں اسرا کے ذکر میں

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۝۳

(تم) ان کی نسل (ہو) جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا تھا۔ وہ شکر گزار بندہ تھا۔ (1803)

وَ قَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَ لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝۴

اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں یقینی خبر دے دی تھی کہ ضرور تم ملک میں دو دفعہ فساد کرو گے اور بڑی سرکشی اختیار کرو گے۔ (1804)

بھی اسی طرف اشارہ تھا۔ جیسا کہ اوپر کے نوٹ سے ظاہر ہے۔ پس سب سے پہلے بتایا کہ ان کی ہدایت کے لیے توریت کو ہم نے بھیجا تھا اور اس کی تعلیم کا اصل الاصول یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوائے اور کسی پر بھروسہ مت کرو۔ وَكِيْل بمعنی مَوْكُوْلُ اِلَيْهِ ہے یعنی جس کے سپرد کام کیے جائیں۔ میرے سوائے کسی کو وکیل نہ بناؤ، گویا عملی رنگ میں توحید ہے اور زبان سے اقرار فائدہ نہیں دیتا، جب تک عمل میں یہ رنگ پیدا نہ ہو کہ ایک خدا کے سوائے اور کسی پر انسان کا بھروسہ نہ ہو۔

1803 - ذُرِّيَّةَ پر نصب اختصاص کی وجہ سے ہے یا ندا ہے۔ بنی اسرائیل حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اور انہیں یہ واقعہ یاد دلایا ہے کہ جب بندے شکر گزاری اختیار کریں تو اللہ تعالیٰ خود ان کے لیے مصائب سے نکلنے کے سامان پیدا کر دیتا ہے۔

1804 - **بنی اسرائیل کا دو بار فساد کرنا اور دو بار ان پر تباہی آنا:** قَضَيْنَآ کے معنی پر [دیکھو نمبر: 1699]۔ دو مرتبہ بنی اسرائیل کے فساد کرنے کی خبر دی ہے۔ مفسرین میں اختلاف ہے کہ کون کون سے واقعات ہیں۔ مگر قرآن کریم نے خود تصریح فرما دی ہے ﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ﴾ [المآئدۃ: 78:5] ''جن لوگوں نے بنی اسرائیل میں سے کفر کیا، ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی۔'' پس یہ دو خبریں وہ ہیں جو ایک دفعہ حضرت داؤد علیہ السلام کی زبان سے دی گئی اور دوسری دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے۔ گو یروشلم پر اور بھی کئی حملے ہوئے اور کم و بیش بربادی وہاں ہوئی۔ مگر یہ تباہی کمال کو دو دفعہ ہی پہنچی ہے اور یہی قوم یہود کی تباہی تھی جیسا کہ ﴿لِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ [7] میں صاف بتا دیا۔ پہلی مرتبہ حضرت داؤد علیہ السلام سے کوئی چار سو سال بعد یعنی حضرت مسیح علیہ السلام سے چھ سو سال پیشتر بابلیوں نے بخت النصر کے ماتحت یروشلم کو فتح کر کے آخر کار ہیکل کو جلا دیا اور دوسری دفعہ حضرت مسیح علیہ السلام سے ستر سال بعد طیطوس رومی نے اسے برباد کیا۔ انہی دونوں تباہیوں کی طرف آیت میں اشارہ ہے اور انہیں بنی اسرائیل کے فساد اور سرکشی کا ہی نتیجہ بتایا ہے۔ حضرت داؤد اور عیسیٰ علیہما السلام کو خاص اس لیے کیا گیا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ذریعہ سے بنی اسرائیل پر جسمانی نعمتیں اکمال کو پہنچیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے روحانی۔ اور دونوں مرتبہ بنی اسرائیل نے سخت ناشکری اور سرکشی اختیار کی، اس لیے سخت مؤاخذہ کے نیچے آئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے الفاظ نقل کرنے کے قابل ہیں:

''پھر جب تم یروشلم کو فوجوں سے گھرا ہوا دیکھو تو جان لینا کہ اس کا اُجڑ جانا نزدیک ہے۔۔۔ ملک میں بڑی مصیبت

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ وَ كَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝۵

سو جب دونوں میں سے پہلا وعدہ آ پہنچا تو ہم نے تم پر اپنے سخت لڑنے والے بندے اٹھا کھڑے کیے پس وہ شہروں کے اندر گھس گئے اور وعدہ پورا ہونا ہی تھا۔ (1805)

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَ جَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝۶

پھر ہم نے لوٹا کر تمہیں ان پر غلبہ دیا اور مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد کی اور تمہیں بڑا جتھا بنایا۔ (1806)

اور اس قوم پر غضب ہوگا اور وہ تلوار کا لقمہ ہو جائیں گے اور اسیر ہو کر سب قوموں کو پہنچائے جائیں گے اور جب تک غیر قوموں کی میعاد پوری نہ ہو یروشلم غیر قوموں سے پامال ہوتا رہے گا۔'' [لوقا: 21:20-42]

اور [متی: 23:38] اور [2:24] میں ہیکل کی تباہی کی پیشگوئی صاف الفاظ میں ہے۔

1805 - جَاسُوْا۔ مصدر جَوْسٌ ہے جس کے معنی تردد یعنی بار بار آنا جانا ہیں اور کسی چیز کا پورے طور پر طلب کرنا بھی اس کے معنی ہیں۔ (ل) یعنی وہ لوگ شہروں کے اندر تمہاری تلاش کے لیے گھس گئے تاکہ کوئی باقی نہ رہ جائے۔

الدِّيَارِ۔ دَارٌ کی جمع ہے جس کے معنی منزل یعنی رہنے کی جگہ بھی ہیں اور شہر پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور اس کا اصل دَوْرٌ سے ہے جس کے معنی گھیر لینا ہیں۔ کیونکہ گھر کا بھی دیوار احاطہ کیے ہوئے ہوتی ہے۔ (غ)

بابلیوں کی بعثت سے مراد:

اللہ تعالیٰ کا بابلیوں کو جنہوں نے بنی اسرائیل کو تباہ کیا ﴿عِبَادًا لَّنَآ﴾ کہا اور ایسا ہی ان کے لیے بَعَثْنَا کا لفظ استعمال کرنا [دیکھو نمبر: 315] صرف اس لحاظ سے ہے کہ اسی نے ان کو ان کی تباہی پر مسلط کیا اور یہ تباہی ان کے لیے سزا کے طور پر تھی۔ جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے بابلیوں کو کھڑا کر دیا۔ یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی تھی یا وہ اللہ تعالیٰ کے راستباز بندے تھے۔

1806 - كَرَّةَ۔ كَرَّ کے اصل معنی ہیں کسی چیز پر پھر کر آنا بالذات ہو یا بالفعل۔ (غ) اسی سے تکرار اور مکرر ہیں ﴿فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ [الشعرآء: 26:102] ''سو کاش اگر ہمارے لیے لوٹ کر جانا ہو تو ہم مومنوں میں سے ہوں۔'' میں كَرَّةً سے مراد ہے دنیا میں دوبارہ آنا۔ اور یہاں كَرَّةَ سے مراد غلبہ ہے۔ کیونکہ ان کی باری ان کے دشمنوں پر ان کا غالب آنا تھا۔

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۫ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ؕ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَ لِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ لِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝

اگر تم نے نیکی کی تو اپنا ہی بھلا کیا، اور اگر تم نے برائی کی تو اپنے لیے۔ پھر جب پچھلی بار کا وعدہ آیا (اور بندے اٹھا کھڑے کیے) تاکہ وہ تمہارا برا حال کریں اور تاکہ وہ مسجدوں میں داخل ہوں جس طرح پہلی بار داخل ہوئے اور تاکہ جس چیز پر وہ غالب آئیں ویران کرتے ہوئے برباد کریں۔ (1807)

یہ کَرَّۃَ یا غلبہ جس کا ذکر یہاں ہے خورس شاہ ایران کے ذریعہ سے وقوع میں آیا جس نے دوبارہ یہودیوں کو یروشلم میں آباد ہونے اور ہیکل بنانے کی اجازت دی۔ اور یہ 536 قبل مسیح میں ہوا۔ نَفِیْرٌ کے معنی جتھا ہیں [دیکھو نمبر: 1291]۔

1807 - ﴿لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ﴾ وجہ کے لیے [دیکھو نمبر: 144]۔ یہاں منہ بھی مراد ہوسکتا ہے کیونکہ مصیبت اور غم کے آثار چہرہ پر ظاہر ہوتے ہیں اور ذات بھی مراد ہوسکتی ہے۔ کیونکہ سُوْءٌ سے یہاں مراد قتل و غارت اور قید کر لینا ہے اور یہ چیزیں انسان کی ذات پر وارد ہوتی ہیں۔ اور لِيَسُوْٓءٗا محذوف سے متعلق ہے اور وہ محذوف وہی ہے جس کا ذکر [آیت: 5] میں ایسے ہی موقعہ پر ہے یعنی ﴿بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ﴾۔

اس آیت میں پہلے اللہ تعالیٰ کا عام قانون بیان کیا کہ جو قوم نیکی کی طرف قدم اٹھاتی ہے اس میں اس کا اپنا ہی بھلا ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد بنی اسرائیل کی دوسری تباہی کا ذکر کیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ بار دوم پھر ان کی بدعملی ہی ان پر وہ سزا لائی جس کا ذکر یہاں ہے۔ اور یہاں ہیکل کی تباہی کا ذکر صاف الفاظ میں کر کے اور ﴿كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ بڑھا کر بتا دیا کہ دونوں مرتبہ ہیکل یعنی بیت المقدس کو تباہ کیا گیا۔

مسلمانوں میں بنی اسرائیل کی تاریخ کا دہرایا جانا:

بنی اسرائیل کے ذکر میں اگر ایک طرف مسلمانوں کو تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ وہ ایسی ناشکری سے بچیں تو دوسری طرف مسلمانوں کی تاریخ بھی اس میں آ جاتی ہے اور حدیث صحیح [لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ] (صحیح البخاری، کتاب الانبیاء، باب مَا ذُكِرَ عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ، حدیث: 3456) نے اسی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جو حالات بنی اسرائیل پر گزرے وہ تم پر بھی گزریں گے۔ چنانچہ اس کے مطابق دو دفعہ مسلمانوں پر بھی تباہی آئی۔ ہاں چونکہ مکہ معظّمہ کو اللہ تعالیٰ نے خاص شرف عطا فرمایا ہے اور اس کے لیے یہ وعدہ ہے کہ وہ دشمن کے ہاتھ سے کبھی برباد نہ ہوگا۔ اس لیے اس تباہی سے خانہ کعبہ کو نقصان نہیں پہنچا۔ لیکن خلافت اسلامی دونوں مرتبہ تباہ کی گئی یعنی بار اول جب بغداد خلافت عباسیہ کے ساتھ تباہ ہوا اور دوسری مرتبہ اب جب یورپ نے سلطنت ترکی کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے خلافت اسلامیہ کو تباہ کیا۔ مگر جیسے پہلی مرتبہ خلافت کی تباہی شوکت اسلامی

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَ اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَ جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝۸

قریب ہے کہ تمہارا رب تم پر رحم کرے اور اگر تم پھر وہی (کام) کرو گے ہم پھر وہی (سزا) دیں گے اور ہم نے دوزخ کو کافروں کے لیے قید خانہ بنایا ہے۔ (1808)

وقف لازم

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَ يُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۝۹

یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو زیادہ مضبوط ہے اور ان مومنوں کو جو اچھے کام کرتے ہیں خوش خبری دیتا ہے کہ ان کے لیے بڑا اجر ہے۔ (1809)

وَّ اَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۱۰ ع 1 10 1

اور کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ہم نے ان کے لیے دردناک دکھ تیار کر رکھا ہے۔

میں تبدیل ہوئی ایسا ہی پھر ہوگا۔

1808 - حَصِيْرًا۔ حَصَرٌ کے معنی روک لینا ہیں۔ پس حصیر سے مراد روک لینے والا یا قید خانہ ہے اور اس کے معنی سِجْنٌ اور فراش دونوں مروی ہیں۔ (ج)

دونوں عذابوں کا ذکر کر کے پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ذکر میں بعثت رحمۃ للعالمین کا ذکر ہے۔ یعنی اب بھی اگر یہ قوم آنحضرت ﷺ کو قبول کر لے تو اللہ تعالیٰ ان پر رحم کر کے انہیں ذلت اور محکومیت کی حالت سے نکال دے گا۔ اور عُدْتُّمْ سے مراد ان کا فساد کی طرف لوٹنا ہے اور عُدْنَا سے اللہ تعالیٰ کا پھر سزا دینا۔

1809 - **توریت کے مقابل قرآن کریم کے امتیازات:** آیت 2 میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کا ذکر کیا تھا کہ اسے ہم نے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا۔ اس آیت میں اس کے مقابل پر قرآن شریف کا ذکر کیا ہے اور اس میں دو باتیں قابل توجہ ہیں۔ ایک تو يَهْدِيْ کا مفعول کسی خاص قوم کو نہیں بنایا جیسے وہاں ﴿هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ تھا۔ پس يَهْدِيْ سے مراد ہے کل لوگوں کو راہ دکھاتا ہے اور دوسرے اس راہ کو اَقْوَمُ کہا ہے یعنی بمقابلہ اس پہلی راہ کے زیادہ مضبوط ہے۔ توریت کی تعلیم بھی مضبوط تھی مگر وہ وقتی تھی اور ایک قوم کے لیے تھی۔ قرآن شریف کی تعلیم ہمیشہ کے لیے ہے اور تمام قوموں کے لیے ہے۔ تمام قوائے انسانی کی تکمیل کرتی ہے۔ اس لیے یہ اس سے زیادہ مضبوط ہے اور بہت زیادہ عرصہ تک قائم رہنے والی ہے۔ اور بنی اسرائیل کے دو مصائب کے ذکر کے بعد تعلیم قرآنی کو اَقْوَمُ کہنے میں یہ بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ گو جس طرح بنی اسرائیل پر مصائب آئیں مسلمانوں پر بھی آئیں گی۔ مگر یہ تعلیم چونکہ زیادہ مضبوط ہے اور تا قیامت باقی رہے گی اس لیے مسلمان اس حالت

وَ یَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَیْرِ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۝۱۱

اور انسان بھلائی مانگنے کی جگہ برائی مانگتا ہے اور انسان جلد باز ہے۔ (1810)

کو نہ پہنچیں گے۔ جس حالت کو بنی اسرائیل پہنچے اور عظیم الشان مصیبت کے بعد پھر اللہ تعالیٰ ان کی دستگیری فرمائے گا۔

1810 - عَجُوْلًا۔ عَجَلَۃ کسی چیز کا اس کے وقت سے پہلے طلب کرنا اور قصد کرنا ہے اور چونکہ یہ اقتضائے شہوت سے ہوتا ہے، اس لیے قرآن کریم کی عام اصطلاح میں اس کا استعمال محل ذم پر ہوتا ہے اور اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ [اَلْعَجَلَۃُ مِنَ الشَّیْطَانُ] یعنی جلدی بازی شیطانی فعل ہے۔ (غ) اور عَاجِلَۃٌ دنیا کو کہتے ہیں۔ (ل) اور یہاں عجول کے معنی یا تو یہ ہیں کہ وہ شر اور عذاب کو جلد مانگتا ہے اور یا یہ کہ وہ طلب منفعت اور دفع مضرت میں جلد باز ہے۔ یعنی جس چیز کا نفع جلد ہوا سے فوراً اپنے لیے چاہتا ہے اور انجام امور پر نظر نہیں کرتا کہ کون سی چیز اس کے حقیقی فائدہ کی ہے اور کون سی حقیقی نقصان کی۔

طلب شر میں انسان کی عجلت سے مراد:

یہاں عموماً یہ مراد سمجھی گئی ہے کہ انسان اپنی جلد بازی سے اپنی اولاد یا اپنے دوستوں وغیرہ پر بددعا کر دیتا ہے۔ مگر سیاق مضمون وسعت معنی کو چاہتا ہے۔ پیچھے قرآن کریم کا ذکر تھا جو انسان کی بھلائی کی راہیں بتاتا ہے اور آگے نتائج اعمال کا ذکر ہے۔ پس یہاں بتایا ہے کہ انسان چونکہ جلد باز ہے اس لیے نفع عاجل یعنی دنیوی نفع کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی حقیقی بھلائی کی راہوں کو ترک کر دیتا ہے۔ یعنی اعمال صالحہ کی پروا نہیں کرتا کیونکہ اس کا نفع دیر سے ملتا ہے۔ اور یوں جہاں اسے بھلائی کا طالب ہونا چاہیے تھا، وہ درحقیقت اپنے لیے شر کا طالب ہو جاتا ہے اور جلد آنے والے نفع کی خاطر اپنے حقیقی نفع کو ترک کر دیتا ہے۔ اسی کے مطابق دوسری جگہ حضرت صالح علیہ السلام کا قول نقل فرمایا ہے ﴿لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّیِّئَۃِ قَبْلَ الْحَسَنَۃِ ۚ لَوْ لَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝﴾ [النمل: 46:27] ''کیوں تم بھلائی سے پہلے دکھ کو جلدی مانگتے ہو۔ کیوں تم اللہ سے استغفار نہیں کرتے تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔'' اور اہل و اولاد وغیرہ پر بددعا اس میں آ جاتی ہے۔ کیونکہ اس سے بھی انسان اپنی فوری خواہش انتقام کو پورا کرنا چاہتا ہے اور نہیں سوچتا کہ وہ بات فی الحقیقت اس کے نقصان کا موجب ہے۔ احادیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی اولاد وغیرہ پر بددعا کرنے سے منع کیا۔ بعض لوگ بے سوچے سمجھے بددعا کے کلمات بول دیتے ہیں اور بعض پیار میں بھی بددعا کے کلمات منہ سے نکال دیتے ہیں۔ ایسا ہی بعض لوگ بیماری کی حالت میں یا شدت درد میں اپنے لیے موت وغیرہ کی دعا کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ سب منع ہے۔

آنحضرت ﷺ کی رحمت:

ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اے اللہ میں بھی بشر ہوں، بشر کی طرح راضی ہو جاتا ہوں اور بشر کی طرح ناراض ہو جاتا ہوں۔ پس اگر میں کسی مومن کے حق میں بددعا کروں تو اسے اس کے لیے پاکیزگی کا موجب بنائیو۔ تعلق اس آیت کا پچھلے رکوع سے یوں ہے کہ وہاں بنی اسرائیل پر سزا آنے کا ذکر تھا۔ یہاں بتایا کہ انسان خود ہی نفع عاجل کے پیچھے

وَ جَعَلْنَا الَّيْلَ وَ النَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَ جَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ وَ كُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ⑫

اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا ہے۔ پھر ہم نے رات کی نشانی کو مٹا دیا اور دن کی نشانی کو روشن بنالیا تا کہ تم اپنے رب کا فضل طلب کرو۔ اور تا کہ سالوں کی گنتی اور حساب کو جانو اور ہر چیز کو ہم نے پوری تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔ (1811)

پڑ کر انجام کار اپنے لیے دکھ لانے کا موجب ہو جاتا ہے۔

1811 - مَحَوْنَآ۔ محو کے معنی نشان کا دور کر دینا یا مٹا دینا ہیں اور آنحضرت ﷺ کے اسمائے مبارک میں اَلْمَاحِی ہے جس کے معنی حدیث میں ہی یوں مروی ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعہ سے کفر کو مٹا دے گا۔

﴿مُبْصِرَةً﴾۔ اَبْصَرَ کے معنی ہیں دیکھا اور کفر سے نکل کر بصیرت ایمانی کی طرف آیا ﴿فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ﴾ [الأنعام: 104:6] ''سو جو کوئی دیکھتا ہے تو وہ اپنی جان (کی بھلائی) کے لیے ہے۔'' میں یہی دوسرے معنی مراد ہیں اور مُبْصِرَةً کے معنی ﴿فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً﴾ [النمل: 13:27] ''سو جب ان کے پاس ہماری بصیرت دینے والی نشانیاں آئیں۔'' میں وَاضِحَةٌ ہیں یعنی صاف صاف اور کھلی کھلی نشانیاں اور ﴿وَ اٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً﴾ [بنی إسرائیل: 59:17] ''اور ہم نے ثمود کو اونٹنی روشن (نشان کے طور پر) دی۔'' میں بَيِّنَةٌ یعنی واضح معنی کیے گئے ہیں یا مُضِيْئَةٌ یعنی روشن کرنے والی (نشانی) اور یہی آخری معنی یہاں ہیں۔ (ل)

رات کی نشانی کے محو کرنے سے مراد:

رات اور دن کے اختلاف سے سالوں کی گنتی اور حساب کا معلوم ہونا تو ایک امر ظاہر ہے اور الحساب سے مراد یہاں وہی حساب ہے جو سالوں کے متعلق ہے یعنی مہینوں، دنوں وغیرہ کا حساب۔ لیکن یہاں فرمایا کہ ہم نے انہیں دو نشان بنایا ہے۔ اس سے کیا مراد ہے؟ بعض نے کہا ہے کہ مضاف محذوف ہے اور مراد ہے [نَيِّرِی الَّيْلَ وَالنَّهَارَ] یعنی رات اور دن کے نیر یعنی چاند اور سورج کو نشان بنایا اور پھر محو سے مراد لیا ہے کہ اس کی یعنی چاند کی شعاع نہیں رکھی یا اس کے نور اصلی کو محو کر دیا۔ (ر) علمی رنگ میں یہ درست ہے کہ چاند آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہو کر اس حالت کو پہنچا اور آثار میں بھی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایسا ہی مروی ہے کہ پہلے چاند بھی سورج کی طرح روشن تھا پھر اس کی وہ اصلی روشنی محو ہو گئی۔ (ج) اور ایک روایت میں یہی لفظ نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کیے گئے ہیں۔ (ر) لیکن اس ظاہر حقیقت کے یہاں لانے میں کیا اشارہ ہے جہاں پہلی آیت میں بھی اعمال انسانی کی جزا کا ذکر ہے اور اس سے اگلی آیت میں بھی اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ رات کی تاریکی اور ظلمت کو مصائب سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ پس جب پہلی آیت میں یہ ذکر کیا کہ انسان اپنی جلد بازی سے اپنے اوپر مصیبت کھینچ لاتا ہے

وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓىِٕرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ ؕ وَ نُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ كِتٰبًا یَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴿۱۳﴾

اور ہر انسان کے عملوں کو ہم نے اس کی گردن میں ڈالا اور ہم اس کے لیے قیامت کے دن ایک کتاب نکالیں گے جسے وہ کھلا ہوا پائے گا۔ (1812)

تو اس آیت میں یہ اشارہ کیا کہ مصیبت آخر گزر جاتی ہے اور اس کی جگہ دن کی روشنی لے لیتی ہے۔ اور ایک طرف اگر ہر فرد بشر کے لیے اس میں خوشخبری ہے کہ مصیبت کے وقت گھبرائے نہیں تو بنی اسرائیل کے ذکر کے بعد مسلمان قوم کے لیے بالخصوص خوشخبری ہے کہ اگر وہ خیر قرآنی کو چھوڑ کر اپنے اوپر مصائب لے آئیں تو پھر بھی رات کی ظلمت کو مٹا کر ان پر دن چڑھا دیا جائے گا۔ اس لیے یہاں لیل کے لیے لفظ محو یا اس کا مٹا دینا اختیار کیا گیا ہے اور دن کے لیے مُبْصِرَۃً لا کر بصیرت ایمانی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آخری الفاظ کہ ہر ایک چیز کو ہم نے تفصیل سے بیان کر دیا ہے، کیسی صداقت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ایک ظاہری قانون کو علمی رنگ میں بیان کر دیا اور ساتھ ہی باطنی قانون بھی کھول کر بتا دیا۔

1812 - طٰٓىِٕرٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 431]۔ انسان کا وہ اچھا اور برا عمل جو اس سے اُڑ جاتا ہے اسے بھی طٰٓىِٕرٌ کہا جاتا ہے۔ جیسے یہاں اور ﴿طَآىِٕرُكُمْ مَّعَكُمْ﴾ [یٰسٓ: 19:36] ''تمہاری نحوست تمہارے ساتھ ہی ہے۔'' اور ﴿طٰٓىِٕرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [النمل: 47:27] ''تمہاری مصیبت اللہ کی طرف سے ہے۔'' میں مراد ان کی شومئ اعمال ہے یعنی وہ برا نتیجہ جو انہیں اپنی بدعملیوں کی وجہ سے ملا۔ (غ) اور طٰٓىِٕرٌ کے معنی عمل سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہیں۔ (ج)

اس آیت میں اعمال خیر و شر اور ان کے نتائج کا ایک نہایت پُر حکمت فلسفہ بیان کیا ہے۔ اول تو عمل کے لیے لفظ طائر استعمال کیا ہے جو گو لغت کے مطابق ہے مگر اس میں اشارہ اس عمل کے اڑ جانے کی طرف ہے۔ یعنی جو کچھ انسان کرتا ہے وہ اس کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ پھر اس کا اس پر اختیار کوئی نہیں رہتا۔ لیکن ایک طرف اگر وہ عمل ہاتھ سے نکل گیا تو دوسری طرف اس کا نتیجہ انسان کی گردن میں باندھ دیا جاتا ہے یعنی اس کے گلے کا ہار بنا دیا جاتا ہے جو اس سے الگ نہیں ہو سکتا۔ عمل کا اڑ جانا اور اس کے نتیجہ کا انسان کے لازم حال ہو جانا یہ دونوں حقیقتیں ہیں جن سے اکثر لوگ بے خبر ہیں۔ وہ عمل کرتے وقت اس قدر لاپروائی برتتے ہیں کہ گویا سب کچھ ان کے قبضہ قدرت میں ہے۔ بہتیرے ہیں جو کہتے ہیں یہ کام کر لیں پھر توبہ کر لیں گے۔ وہ نہیں جانتے کہ جو عمل ہو گیا وہ پھر ہاتھ نہیں آتا۔ اور بہتیرے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ عمل کا نتیجہ کوئی شے نہیں۔ اس لیے کہ انہیں کھلا کھلا نتیجہ ہر عمل کا نظر نہیں آتا۔ اس لیے یہ کہہ کر کہ ہر عمل کے نتیجہ کو ہم نے انسان کے لازم حال کر دیا ہے فرمایا کہ وہ نتیجہ کھلا کھلا بے شک یہاں نظر نہیں آتا مگر قیامت کے دن وہ ایک کھلی کتاب کی صورت میں ہوگا یعنی وہ پردے جو اب انسان کو اسے دیکھنے نہیں دیتے اس وقت اُٹھ جائیں گے۔ دوسری جگہ ہے ﴿لَقَدْ كُنْتَ فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ ﴿۲۲﴾﴾ [قٓ: 22:50] ''یقیناً تو اس سے غفلت میں تھا تو ہم نے تیرا پردہ تجھ سے ہٹا دیا، پس تیری نگاہ آج تیز ہے۔'' اور یہاں اسے کتاب منشور کہا ہے یعنی کھلا کھلا اس کے سامنے آموجود ہوگا۔ اور بعض نے کتاب منشور کی تفسیریوں کی ہے کہ اعمال کے آثار نفس پر منقش

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴿۱۴﴾

اپنی کتاب پڑھ، آج تو خود ہی اپنا حساب لینے کے لیے کافی ہے۔ (1813)

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ؕ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾

جو شخص سیدھی راہ پر چلا وہ اپنے ہی لیے سیدھی راہ پر چلا اور جو گمراہ رہا تو تُو اپنے اوپر وبال کے لیے گمراہ رہا اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا اور ہم عذاب دینے والے نہ تھے یہاں تک کہ ایک رسول کو اٹھا کر کھڑا کرتے۔ (1814)

ہوں گے۔ کیونکہ ہر فعل کا اثر روح پر ساتھ ساتھ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن حواس موجودہ میں وہ اثر خفا کا رنگ رکھتا ہے اور جب ان حواس کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے تب وہ اثر بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ (ر) اس پر اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ اس صورت میں قیامت سے مراد قیامت صغریٰ یا ایک شخص کی موت ہوگی اور کہ یہ ظاہر کے خلاف ہے۔ مگر یہ تو بہر حال ماننا پڑے گا کہ کتاب سے مراد اس قسم کے کاغذ نہیں جو ہماری ان قلموں اور سیاہی سے لکھے گئے ہوں۔ کراماً کاتبین ان قلموں اور دواتوں سے اور اس کاغذ پر نہیں لکھتے۔ اور کتاب کے معنی میں لغت میں وسعت ہے [دیکھو نمبر: 1412] وغیرہ۔ اور پھر اسے کتاب منشور کہا ہے جس سے یہ مراد نہیں ہو سکتی کہ وہ کسی ایک جگہ سے کھول کر رکھی ہوئی ہے کیونکہ اس صورت میں اس کے باقی سارے حصے بند ہوئے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ ہر جگہ سے کھلی ہے اور سب کا سب جو اس میں لکھا ہے ایک نظر میں نظر آ جاتا ہے۔ اگر یہ مراد نہ ہوتی تو اسے منشور کہنا بے فائدہ تھا۔ پس وہ کتاب اس لحاظ سے ہے کہ اس میں اعمال محفوظ ہیں اور منشور اس لحاظ سے ہے کہ ان اعمال کے نتائج صاف صاف نظر آتے ہیں۔

1813 - یہاں بتایا ہے کہ انسان کے محاسبہ کے لیے اس کا اپنا نفس ہی قیامت کے دن کافی ہوگا۔ اس میں صاف اس حقیقت کو آشکارا کر دیا ہے جس کا ذکر اوپر ہوا کہ نفس کی حالت ہی خود سب کچھ ظاہر کر دے گی۔ پس ﴿اِقْرَاْ كِتٰبَكَ﴾ میں جو پڑھنے کا ارشاد ہے وہ بھی دوسرے رنگ کا پڑھنا ہے۔ کیونکہ کہیں تو یہ ذکر ہے کہ میزان قائم کی جائے گی۔ گویا اعمال ناموں کا وزن ہوگا اور کہیں یہ ذکر ہے کہ جیسے یہاں کہ انسان کا اپنا نفس ہی حساب کر لے گا اور کہیں اسی اعمالنامہ کے پڑھنے کے لیے دوسروں کو بلایا جاتا ہے ﴿هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ﴾ [الحاقة: 19:69] ''لو میری کتاب پڑھو'' حقیقت یہی ہے کہ جو چیزیں اس دوسرے عالم سے تعلق رکھتی ہیں ان کو اس عالم پر قیاس کرنا غلطی ہے۔ ہاں سمجھایا انہی الفاظ میں جا سکتا تھا جو یہاں کی چیزوں پر بولے جاتے ہیں۔ وہ سب حق ہے جس کا ذکر قرآن و حدیث میں ہے۔ کس رنگ میں وہ واقع ہوگا اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے۔

1814 - پہلی آیت کا مضمون اس آیت میں جاری رکھا گیا ہے اور اس کی تکمیل کی گئی ہے۔ جب اعمال کی جزا و سزا کا قانون بتایا اور یہ بھی بتایا کہ قیامت کے دن یہ جزا و سزا کھل کر نظر آ جائے گی تو اب بتایا ہے کہ ہدایت اختیار کرنے والا اپنے اعمال کا اچھا نتیجہ

اپنے آپ میں دیکھ لے گا اور گمراہ اپنی گمراہی کا برا نتیجہ اپنے اندر دیکھ لے گا۔ گویا ہر ایک کو وہ کھلا نتیجہ جس کا ذکر اوپر تھا وہ کتاب منشور اپنے نفس میں ہی اسے نظر آ جائی گی۔ اور پھر بتایا کہ اس نتیجہ کا تعلق نفس انسانی سے ایسا ہے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی دوسرا انسان اسے اپنے ذمہ لے کر عمل کرنے والے کو چھڑا دے۔ اور جب اس قانون جزا و سزا کی یوں تکمیل کر دی تو پھر ایک اور پہلو سے بھی اس کی تکمیل فرمائی۔ یعنی یہ فرمایا کہ اعمال کی یہ سزا انسان کو بے خبری کی حالت میں نہیں دی جاتی بلکہ پہلے ہم نے اپنے رسول بھیج کر لوگوں کو اس بات کی خبر پہنچا دی کہ اعمال کی جزا و سزا یوں ظاہر ہوتی ہے اور قرآن کریم کی متعدد آیات سے یہ ظاہر ہے کہ جب تک رسول بھیج کر نیکی اور بدی کا صحیح احساس پیدا نہ کیا جائے گا اس وقت تک عذاب نہ دیا جائے گا ﴿وَ سِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَ قَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ﴾[الزمر: 71:39] ''اور جو کافر ہیں وہ دوزخ کی طرف گروہ گروہ بنا کر لے جائے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچ جائیں گے اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور اس کے چوکیدار اُن سے کہیں گے کیا تم میں سے تمہارے پاس رسول نہ آئے تھے جو تم پر تمہارے رب کی آیتیں پڑھتے تھے۔'' ﴿اَوَ لَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَ جَآءَكُمُ النَّذِيْرُ﴾[فاطر: 37:35] ''کیا ہم نے تمہیں اتنی عمر نہ دی تھی کہ اس میں نصیحت حاصل کر لیتا جو نصیحت حاصل کرنا چاہتا تھا اور تمہارے پاس ڈرانے والا آیا۔'' ﴿كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ﴾[الملك: 67:8-9] ''جب کبھی اس میں ایک گروہ ڈالا جائے گا اس کے چوکیدار اُن سے پوچھیں گے کیا تمہارے پاس ڈرانے والا نہ آیا تھا۔ کہیں گے ہاں! ہمارے پاس ڈرانے والا آیا تھا۔'' ان تصریحات قرآنی کے ہوتے ہوئے ﴿مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝﴾ کے اور کوئی معنی کرنا سخت غلطی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ گو اللہ تعالیٰ کی ہستی بلکہ اس کی توحید کا علم بھی کچھ نہ کچھ قدرت کے مطالعہ سے معلوم ہو جاتا ہے اور فطرت انسانی کے اندر بھی وہ مرکوز ہے، مگر زندگی بعد الموت کا علم یا جزا و سزا کا وہ قانون جس کا ذکر اوپر ہوا اس کا علم صرف انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے دنیا میں آیا۔ کیونکہ انسان کی اپنی عقل کی روشنی اس قدر دور کے نتائج دیکھ نہ سکتی تھی۔ پس اسی بات کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی یہ شان کہاں ہو سکتی تھی کہ لوگوں کو ایسے قانون کے ماتحت سزا دے جس کا انہیں علم ہی نہیں دیا گیا اور عذاب دینے کا ذکر اس لیے کیا کہ نیک اعمال کے نتائج تو وہ بہر حال ہی دے گا۔ کیونکہ یہ اس کی رحمت کا تقاضا ہے اور اسی رحمت کا یہ تقاضا ہے کہ عذاب نہ دے جب تک کہ پہلے بتا نہ دے کہ یہ امر سزا کے لائق ہے تا کہ انسان متنبہ ہو جائے۔

بچہ جزا و سزائے اعمال کے قانون سے باہر ہے:

یہی وجہ ہے کہ اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ ایک بچہ جس میں ابھی نیکی بدی کا احساس ہی پیدا نہیں ہوا یا وہ لوگ جنہیں انبیاء کی تعلیم ہی نہیں پہنچی وہ کسی مؤاخذہ کے نیچے نہیں۔ اور غور کیا جائے تو یہ بات ایک پُر حکمت فلسفہ پر مبنی ہے۔ ایک خشک منطقی کہہ سکتا ہے کہ بچہ ہو یا بے خبر انسان خدا تعالیٰ کا قانون تو اپنا کام کر کے رہے گا۔ ایک بچہ بھی آگ میں ہاتھ ڈالے گا تو اس کا ہاتھ جل جائے گا۔ اس کے بچہ ہونے کی وجہ سے یا بے خبر ہونے کی وجہ سے وہ جلنے سے نہیں بچے گا۔ یہ سچ ہے لیکن ہر بات میں ظاہری قوانین پر اخلاقی قوانین کا قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاق کا تعلق احساس سے ہے، وہ ایک باطنی چیز ہے۔ بسا اوقات بچہ ایک

وَ اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا

اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ کسی بستی کو ہلاک کریں تو اس کے آسودہ حال لوگوں کو حکم بھیجتے ہیں پھر وہ اس میں نافرمانی کرتے ہیں تب (سزا کا) حکم اس پر ثابت

بات خلاف واقعہ کہہ دیتا ہے یا ایک چیز کو چھپالیتا ہے مگر ان باتوں کا کوئی اثر اس کی زندگی پر نہیں پڑتا۔ لیکن وہی فعل ایک ایسا آدمی کرے جس میں نیکی بدی کا احساس پیدا ہو چکا ہے تو اس کا اثر یقیناً اس کی طبیعت پر پڑے گا۔ پس اللہ تعالیٰ کے قوانین اخلاق کا تعلق احساس سے ہے اور یہی احساس انبیاء پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے بچہ تو کوئی بھی مواخذہ کے نیچے نہیں خواہ وہ ایک کافر کا بچہ ہو۔ اور نبی کریم ﷺ کا صاف ارشاد ہے [مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ يُولَدُ إِلَّا عَلَى الْفِطْرَةِ] (مسند أحمد، جلد14، صفحہ233، حدیث : 8562) ہر ایک بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ سے جب کفار کے بچوں کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ اہل جنت کے خادم ہوں گے۔ (ث) شاید غلمان میں اسی طرف اشارہ ہو اور جن لوگوں نے کفار کے بچوں کو قابل مؤاخذہ سمجھا ہے اور یہ خیال کیا ہے کہ کفار کے بچے جو بلوغت سے پہلے فوت ہو جائیں وہ اپنے آباء کی وجہ سے دوزخ میں جائیں گے انہوں نے غلطی کی ہے۔ اور یہی حکم فاتر العقل لوگوں کے بارہ میں ہے اور مسند احمد کی حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن چار قسم کے لوگ عذر پیش کریں گے یعنی بہرا، فاتر العقل اور بہت بوڑھا اور جو شخص زمانہ فترت میں مر گیا تو اللہ تعالیٰ انہیں حکم دے گا کہ آگ میں داخل ہو جاؤ۔ سو اگر وہ داخل ہو جائیں تو آگ ان پر ٹھنڈی ہو جائے گی۔ اس میں یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء اللہ بھی درحقیقت ایک قسم کی آگ ہی میں انسان کو داخل ہونے کا حکم دیتے ہیں اور وہ عشق الٰہی کی آگ ہے جو دنیا کی محبت کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ اور جو اس آگ میں داخل ہو جاتا ہے وہ دیکھ لیتا ہے کہ یہی انسان کی حقیقی راحت ہے اور اسی حکم میں وہ لوگ ہیں جو تعلیم انبیاء سے بے خبر ہیں۔ اور بعض نے یہاں رسول میں عقل کو بھی شامل کیا ہے۔ یعنی جن کو عقل دی گئی ہے۔ وہی ان کے لیے رسول کا حکم رکھتی ہے۔ بلکہ بعض نے تو کہا ہے کہ ﴿ نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴾ سے مراد ہی رسول عقل ہے کیونکہ اصلی رسول وہی ہے۔ (ز) مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی سلسلہ نبوت شروع کر دیا اور دوسری طرف یہ بھی فرمایا کہ ﴿ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴾ [فاطر: 24:35] ''کوئی قوم نہیں مگر اس میں ڈرانے والا گزر چکا۔'' تو گویا رسولوں کی بعثت سب اقوام کی طرف ہو گئیں۔ ہاں اگر کوئی قوم ابھی وحشت کی حالت سے باہر نہیں نکلی تو اس کی حالت ایک بچہ سے مشابہ ہوگی جس میں ابھی احساس اخلاق پیدا ہی نہیں ہوا۔ اور جب ہم متمدن دنیا کی حالت دیکھتے ہیں اور امم انسانی کی حالت پر غور کرتے ہیں تو ہر ایک قوم کے اندر کوئی نہ کوئی معلم ایسا پاتے ہیں جس کے ذریعہ سے انہیں نیک و بد کی جزا و سزا کا علم دیا گیا۔ بلکہ مذاہب میں گو اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے متعلق بڑے بڑے اختلافات ہیں، لیکن اعمال کی جزا و سزا میں سب متفق ہیں۔ حتیٰ کہ عیسائی بھی جو کفارہ کو ہی بظاہر کافی سمجھتے ہیں۔ پس جملہ اقوام کو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے یہ علم ہو چکا ہے کہ اعمال انسانی کی جزا و سزا بھی ہے۔

الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ⑯

ہو جاتا ہے۔ سو ہم اسے ہلاک کر دیتے ہیں جیسا ہلاک کرنا چاہیے۔ (1815)

دنیوی عذاب اور بعثت رسل:

سیاق وسباق کے لحاظ سے ان الفاظ کے معنی اور نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر یہاں مراد عذاب دنیوی لیا جائے تو بھی مفہوم یہی ہوگا کہ دنیا کی قوموں پر جو ہم بعض وقت ان کے سخت ظلموں کی وجہ سے عذاب دنیوی بھیجتے ہیں تو وہ بھی انہیں اعمال کی جزا وسزا کے قانون سے واقف کرنے کے بعد بھیجتے ہیں اور یہ خبر بذریعہ انبیاء علیہم السلام جو کل قوموں میں مبعوث ہو چکے ہم نے ان کو پہنچا دی ہے۔ دنیا کی جاہل سے جاہل قومیں بھی اعمال کی جزا وسزا کا علم اور احساس رکھتی ہیں۔ کیونکہ سب میں رسول مبعوث ہو چکے ہیں۔ لیکن جو لوگ ان الفاظ سے یہ مراد لیتے ہیں کہ دنیا میں کبھی کوئی عذاب نہیں آتا جب تک کہ پہلے ایک رسول اس وقت مبعوث نہ کیا جائے وہ غلطی کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قوانین کل دنیا کو بتا دیئے ہیں، جو عذاب آئے گا وہ ان قوانین کو توڑنے کی وجہ سے آئے گا۔ پس نئے رسول کی ضرورت نہیں اور جو مجدد اس رسول اور اس کتاب کی طرف بلاتا ہے وہ محض ظل ہے نہ اصل۔ پھر اگر رسول کی ضرورت ہے تو عین اس مقام پر ہے جہاں عذاب آئے۔ مثلاً جنگ کا عذاب یورپ میں آئے یا کوئی بھاری زلزلہ اٹلی میں آئے اور اس سے دلیل یہ لی جائے کہ ضرور ہے کہ اس وقت کوئی رسول مبعوث ہو گیا ہو تو پھر ایسے رسول کا ہندوستان میں مبعوث ہونا خدائے حکیم کا فعل نہیں ہو سکتا، جس میں حکمت بھی کچھ نہیں۔ وہ رسول یورپ یا اٹلی میں آنا چاہیے تھا۔ پھر دوسری دقت یہ ہے کہ ہر رسول کے لیے ایک وقت مقرر کرنا پڑے گا کہ اگر اس کے بعد اتنے عرصہ تک عذاب آئے تو وہ اس کی بعثت کی وجہ سے ہوگا اور اگر اس میعاد کے بعد آئے تو نیا رسول چاہیے۔ اور اب جو عذاب آ رہے ہیں اگر ان کے لیے کوئی نیا رسول پیدا ہونا ضروری ہو چکا ہے تو اب آئندہ رسول کی کب ضرورت ہوگی۔ آیا یہ قانون تیرہ سو سال کا بن جائے گا؟ ایسی باتیں کرنا گویا لوگوں کو یہ بتانا ہے کہ مذہب علم نہیں بلکہ کھیل ہے۔

1815- ﴿نُّهْلِكَ﴾۔ هَلَاكَ کئی طرح پر ہے۔ ایک چیز ہم سے گم ہو جاتی ہے اور دوسرے کے پاس موجود ہوتی ہے جیسے ﴿هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ ۚ﴾ [الحاقة: 29:69] ''میرا غلبہ مجھ سے جاتا رہا'' اور ایک ہلاک استحالہ اور فساد ہے یعنی بگڑ جانے سے جیسے ﴿وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ﴾ [البقرة: 205:2] ''اور کھیتی اور نسل کو ہلاک کرے۔'' اور ایک ہلاک موت ہے جس کی مثالیں بہت ہیں۔ اور ایک چیز کا عالم سے باطل ہو جانا اور اس کا اصلاً نابود ہو جانا بھی ہلاک ہے۔ ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ﴾ [القصص: 88:28] ''ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کے جس سے اس کا ارادہ کیا جائے۔'' اور عذاب اور خوف اور فقر کو بھی ہلاک کہا جاتا ہے ﴿وَ اِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ﴾ [الأنعام: 26:6] ''اور وہ صرف اپنے آپ کو ہی ہلاک کرتے ہیں۔'' ﴿كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ﴾ [الأنعام: 6:6] ''کس قدر ان سے پہلے ہم نے نسلیں ہلاک کر دیں۔'' ﴿وَ كَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا﴾ [الأعراف: 4:7] ''اور کتنی بستیاں ہم نے ہلاک کر دیں۔'' ﴿فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۱۷﴾

اور کتنی نسلیں ہم نے نوح کے بعد ہلاک کر دیں، اور تیرا رب اپنے بندوں کے گناہوں سے خبردار دیکھنے والا بس ہے۔

[الأحقاف: 35:46] ''تو کیا سوائے نافرمان لوگوں کے کوئی اور بھی ہلاک کیا جائے گا۔'' میں ہلاک اکبر مراد ہے۔جس کی طرف آنحضرت ﷺ کے اس قول کی طرف اشارہ ہے[لَا شَرَّ كَشَرِّ بَعْدَهُ النَّارِ] یعنی کوئی شر اس شر کے برابر نہیں جس کے بعد آگ ہے۔(غ)

اَمَرْنَا۔ اَمَرْ کے معنی حکم دینا مشہور ہیں اور جس چیز کا حکم دیا وہ محذوف ہے جو طاعۃ اللہ ہے۔جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔(ج) اور اس کے معنی اَكْثَرْنَا بھی مروی ہیں۔(ج) یعنی ان کی کثرت کر دی اور لغت میں [اَمْرَ الْقَوْمُ] کے معنی كَثُرُوْا ہیں گویا بوجہ اپنی کثرت کے ایسے ہو گئے کہ ان کے لیے امیر کا ہونا ضروری ہو گیا اور اسی لحاظ سے یہاں كَثَّرْنَا معنی درست تسلیم کیے گئے ہیں۔اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے ان معنوں کو صحیح تسلیم کیا ہے۔(غ)

﴿دَمَّرْنَا﴾۔ تَدْمِیْر کے معنی ہیں کسی چیز پر ہلاکت کا داخل کرنا۔(غ)

عذاب ہلاکت کا وقت اور غرض:

اصل ذکر تو آخرت کے عذاب کا ہی چلتا ہے اور [آیت:18] میں صاف کہہ بھی دیا ہے کہ طالب دنیا کو ہم دنیا کے فوائد بھی دے دیتے ہیں۔پھر آخرت میں وہ جہنم میں جاتا ہے۔لیکن یہاں اسی عذاب آخرت کے لیے بطور دلیل اس بات کو بیان کیا ہے کہ جب بدی انتہا کو پہنچ جاتی ہے اور ایک قوم کی قوم اس میں مبتلا ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس دنیا میں بھی کھلا کھلا ہلاکت کا عذاب بھیج دیتا ہے تاکہ عذاب آخرت محض ایک قصہ کہانی نہ رہ جائے۔چنانچہ فرمایا کہ کسی بستی کے رہنے والوں کو جب فسق و فجور کی کثرت ہو جائے تو ہلاک بھی کر دیتے ہیں۔﴿اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا﴾ کے دونوں معنی اوپر دے دیئے گئے ہیں۔حکم کے معنی لے کر بھی یہ ضروری نہیں کہ اس وقت کوئی نیا رسول بھیج کر نیا حکم دیا جائے بلکہ احکام تو رسولوں کے ذریعہ سے فسق و فجور سے بچنے کے لیے ہر قوم کو اللہ تعالیٰ دے ہی چکا ہے۔بلکہ انسان کو عقل دے کر بھی اسے اپنے احکام پہنچا دیئے ہیں۔یہ معنی کرنا کہ فسق و فجور کا حکم انہیں دے دیتے ہیں خلاف قرآن ہیں۔﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ﴾[الأعراف: 28:7] ''اللہ (کبھی) بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔'' اور یہ سچ ہے کہ جب تک قوم میں فساق کی کثرت نہ ہو جائے وہ ہلاک نہیں ہوتی۔اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہلاکت سے مراد لازماً اس قوم کا موت کے گھاٹ اتارنا ہی نہیں ہوتا۔بلکہ اس کی قوت و طاقت کو برباد کر دینا بھی اس کی ہلاکت ہی ہے۔جیسا کہ لفظ ہلاک کی تشریح میں بھی بتا دیا گیا ہے۔اگلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ اس قانون کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام کے بعد بھی بہتیری قوموں کو ہلاک کیا۔ہاں قوم کے ذنوب اس قدر ہو جانا کہ ان پر اسی دنیا میں ہلاکت آ جائے اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے۔کوئی انسان اس میں دخل نہیں دے سکتا کہ فلاں قوم فلاں وقت ہلاک کیوں نہ ہوئی۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾

جو کوئی جلد آنے والا نفع چاہتا ہے ہم اسے اسی (دنیا) میں جو کچھ ہم چاہتے ہیں جس کے لیے ارادہ کریں جلد دے دیتے ہیں پھر ہم نے اس کے لیے دوزخ ٹھہرائی ہے وہ اس میں برے حال میں دھتکارا ہوا داخل ہوگا۔ (1816)

وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾

اور جو آخرت کو چاہتا ہے اور اس کے لیے کوشش کرتا ہے جو اس کی کوشش کا حق ہے اور وہ مومن ہے تو یہی ہیں جن کی کوشش کی قدر کی جاتی ہے۔ (1817)

1816 - یہاں پھر رکوع کی پہلی آیت کے مضمون کی طرف رجوع کیا ہے۔ اَلْعَاجِلَةَ سے مراد دنیا ہے [دیکھو نمبر: 1810]۔ کیونکہ اس کا نفع جلد ملتا ہے۔ یہاں اس شخص کا ذکر ہے جو اس زندگی کے نفع عاجل کو اپنی زندگی کی اصل غرض بنا لیتا ہے۔ فرمایا کہ اسے ہم جس قدر چاہتے ہیں دنیا بھی دے دیتے ہیں۔ ﴿مَا نَشَآءُ﴾ اس لیے کہا کہ دنیا کی ہوس ساری کبھی پوری نہیں ہوتی۔ دوسری جگہ ہے ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا﴾ [الشوریٰ: 20:42] ''اور جو کوئی دنیا کی کھیتی چاہتا ہے ہم اس میں سے کچھ اسے دے دیں گے۔'' مگر نتیجہ اس کا جہنم ہے یعنی انجام کار ایسا شخص جس کی نظر اس دنیا سے اوپر نہیں اٹھتی دکھ اٹھاتا ہے۔

1817 - سَعٰی۔ سَعی کے معنی تیز چلنا ہیں اور اس کا استعمال کسی معاملہ میں کوشش کرنے پر بھی ہوتا ہے اچھا ہو یا برا ﴿وَ سَعٰى فِيْ خَرَابِهَا﴾ [البقرۃ: 114:2] ''ان کے ویران کرنے کی کوشش کرتا ہے۔'' ﴿وَ اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۙ﴾ [النجم: 39:53] ''اور کہ انسان کے لیے کچھ نہیں، مگر وہی جو وہ کوشش کرتا ہے۔'' اور اس کا اکثر استعمال افعال محمودہ میں ہے۔ (غ) اور ﴿سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا﴾ کے معنی ہوئے ایسی کوشش کرے جو حق کوشش ہے۔

﴿مَّشْكُوْرًا﴾۔ شُکْرٌ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 75]۔ اور اللہ تعالیٰ کا شکر اپنے بندوں پر انعام اور ان کو جزا دینا ہے۔ (غ) اور اسی لحاظ سے یہاں مشکور کہا گیا ہے۔

یہاں فرمایا کہ جو آخرت کو اپنا مقصد بناتا ہے تو اس کی کوشش پر ضرور انعام ملتا ہے بشرطیکہ کوشش کا حق ادا ہو۔ گویا وہ لازماً کامیاب ہوتا ہے۔ دوسری جگہ ہے ﴿الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ [العنکبوت: 69:29] ''جو لوگ ہمارے لیے محنت اٹھاتے ہیں ہم یقیناً انہیں اپنے رستوں پر چلائیں گے۔''

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾

ہم سب کو مدد دیتے ہیں اُن کو بھی اور ان کو بھی، تیرے رب کی عطا سے اور تیرے رب کی عطا کبھی رکتی نہیں۔ (1818)

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ وَ لَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿۲۱﴾

دیکھ ہم کس طرح بعض کو بعض پر فضیلت دیتے ہیں اور یقیناً آخرت درجات میں بڑھ کر اور فضیلت میں برتر ہے۔ (1819)

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴿۲۲﴾ ع 2 12 2

اللہ کے ساتھ دوسرا معبود نہ بنانا ورنہ تو برے حال میں بے کس ہو کر بیٹھ جائے گا۔ (1820)

وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾

اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوائے (کسی کی) عبادت نہ کرو اور ماں باپ سے نیکی کرو۔ اگر تیرے سامنے دونوں میں سے ایک یا دونوں ہی بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اُف (تک) نہ کہہ اور نہ ان کو ڈانٹ اور ان دونوں سے ادب سے بات کر۔ (1821)

1818 - ﴿مَحْظُوْرًا﴾۔ حَظْرٌ کے معنی روکنا ہیں اور مَحْظُوْرٌ کے معنی ہوئے روکی گئی چیز۔ (ل)

1819 - یعنی دنیا میں انسان کوشش کر کے ایک دوسرے سے بڑھ جاتے ہیں تو آخرت کے لیے جو بھی کوشش کرے گا وہ بڑھ جائے گا۔ بلکہ وہ مراتب تو بہت بڑھ کر ہیں۔

1820 - یعنی اللہ کے ساتھ اور کسی کو اپنا محبوب اور مطلوب اور مقصود نہ بناؤ۔ اور تَقْعُدَ (بیٹھ جائے گا) سے مراد یا مطلق ٹھہرنا ہے یا عجز۔

1821 - اُفٍّ۔ کان یا ناخن کی میل یا ناخن تراش یا اور ایسی چیزوں کو کہا جاتا ہے جن کو حقیر سمجھا جائے اور قلیل چیز پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے (ل) ﴿اُفٍّ لَّكُمْ وَ لِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [الأنبیآء: 67:21] ''تف ہے تم پر اور اس پر جس کی تم اللہ کے سوائے عبادت کرتے ہو۔''

وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾

اور ان دونوں کے آگے رحم کے ساتھ عاجزی کا بازو جھکا اور کہہ اے میرے رب تو ان پر رحم کر جس طرح انہوں نے مجھے چھوٹے ہوتے پالا۔ (1822)

تَنْهَرْ۔ نَهَرَ مشہور ہے اور اس کے معنی شدت کے ساتھ روکنا یا ڈانٹنا بھی آتے ہیں [اَلزَّجْرُ بِمُغَالِظَةٍ]، ﴿وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ﴿۱۰﴾﴾ [الضحیٰ: 10:93] ''اور سوالی کو نہ ڈانٹ۔'' پس اُف میں تحقیر ہے اور نہر میں سختی۔

اخلاق فاضلہ کی جڑ کیا ہے:

پچھلے رکوع میں یہ بیان کر کے کہ پست اغراض کو سامنے رکھنے سے انسان آخر کار نقصان اٹھاتا ہے، اس اور اگلے رکوع میں کچھ اخلاق فاضلہ کی تعلیم دی ہے۔ اور توریت کی گویا ساری تعلیم جو دس احکام پر مشتمل ہے اس رکوع اور اگلے رکوع میں آجاتی ہے۔ مگر اس سے بہت زیادہ بسط اور بہت زیادہ وضاحت کے ساتھ اور اکمل رنگ میں، اور یہ تعلیم اخلاق فاضلہ کی اس یعنی تئیسویں آیت سے لے کر سینتیسویں آیت تک ہے جو کل پندرہ آیتیں ہیں اور ابن جریر میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول منقول ہے [التَّوْرَاةُ كُلُّهَا فِي خَمْسَ عَشْرَةَ آيَةً مِنْ سُورَةِ بَنِي إِسْرَائِيلَ.] (التحریر والتنویر، جلد15، صفحہ 8) یعنی ساری توریت سورت بنی اسرائیل کی پندرہ آیتوں میں ہے۔ اور یہاں اس تعلیم کو شروع بھی توحید الٰہی سے کیا ہے اور توریت کے دس احکام کی ابتدا بھی توحید سے ہی ہوتی ہے اور اس کی ابتدا اس سے کی ہے کہ اللہ کے سوائے کسی کی عبادت نہ ہو۔ گویا یہ اخلاق فاضلہ کی جڑ ہے اور یہی سچ ہے کہ جو شخص ایک خدا کے آگے سر نہیں جھکاتا نہ وہ اخلاق کے بلند ترین مقام پر پہنچ سکتا ہے اور نہ وہ جو ہر چیز کے سامنے سر جھکاتا پھرتا ہے اور تذلل اختیار کرتا ہے۔ انسان سے بالاتر سوائے خدا کے کوئی طاقت نہیں۔ یہی ایک چیز ہے جس کا اعتراف انسان کو انسان بناتا ہے اور اخلاق فاضلہ پر قائم کرتا ہے۔

والدین سے سلوک:

اس کے بعد انسانوں سے حسن سلوک کا حکم دیا اور اس میں سب سے پہلے والدین کے حقوق کی طرف توجہ دلائی، کیونکہ وہ انسان کی ربوبیت جسمانی کرنے میں سب سے بڑھ کر ہیں اور احسان کی تاکید کے ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ ان کو کوئی تحقیر کا کلمہ نہ کہا جائے اور نہ ان کو سختی سے کسی کام سے روکا جائے۔ بلکہ قول کریم یعنی ایسے قول کے ساتھ جس میں ان کا اکرام ہو انہیں مخاطب کیا جائے اور بڑھاپے کا ذکر اس لیے کیا کہ بڑھاپے میں انسان کی طبیعت کمزور ہو جاتی ہے اور اس وقت والدین اولاد پر کچھ زیادتی بھی کر لیتے ہیں وہی وقت ہوتا ہے جب اولاد کو والدین کے ساتھ اخلاق سے پیش آنے اور احسان کرنے کا موقعہ ہوتا ہے۔ اور یہ زمانہ بچپن کے زمانہ سے زیادہ مشابہ ہوتا ہے اور یہاں خطاب عام ہے۔

1822 - ﴿جَنَاحَ الذُّلِّ﴾۔ جَنَاحٌ کے اصل معنی پرند کا بازو ہیں۔ اور انسان کے جناح سے مراد اس کا ہاتھ ہوتا ہے ذُلّ فرمانبرداری

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِیْ نُفُوْسِكُمْ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِیْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾

تمہارا رب خوب جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے اگر تم نیک ہو تو وہ رجوع کرنے والوں کو بخشنا ہے۔

وَ اٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِیْنَ وَ ابْنَ السَّبِیْلِ وَ لَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا ﴿۲۶﴾

اور قریبی کو اس کا حق دے اور مسکین اور مسافر کو (بھی) اور بے جا خرچ کر کے (مال کو) نہ اُڑا۔ (1823)

ہے جو دوسرے کے غلبہ کی وجہ سے ہو اور راغب کہتے ہیں کہ ﴿جَنَاحَ الذُّلِّ﴾ استعارہ ہے کیونکہ فرمانبرداری یا اطاعت دو طرح پر ہے۔ ایک وہ جو انسان کو پستی کی طرف لے جاتی ہے اور دوسری وہ جو اس کا رفع کرتی ہے یعنی اس کا مقام بلند کرتی ہے۔ اور چونکہ یہاں وہ فرمانبرداری مراد ہے جو اس کا مرتبہ بلند کرتی ہے اس لیے لفظ جَنَاحَ استعارۃً لایا گیا۔ گویا یوں فرمایا گیا کہ وہ فرمانبرداری اختیار کرو جو تمہارے اکتساب رحمت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے حضور تمہارا مرتبہ بلند کرتی ہے۔ (غ) اور یا ﴿مِنَ الرَّحْمَةِ﴾ سے مراد ہے فرط رحمت سے بھر کر۔ (ر)

یہاں پچھلی آیت کے مضمون کی تکمیل کی ہے اور بتایا ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک محبت سے ہونا چاہیے۔ یعنی انسان کا دل ان کی محبت سے بھرا ہوا ہو۔ جس طرح ان کا دل اولاد کی محبت سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ ان کے لیے دعائیں بھی کرے اور ﴿كَمَا رَبَّيٰنِیْ﴾ میں یہ بتایا کہ وہ رحمت ایسی ہو جس رحمت کے ساتھ انہوں نے اولاد کی پرورش بچہ ہونے کی حالت میں کی تھی۔ کیونکہ وہ کمال درجہ کی رحمت تھی اور دوسرا اس تشبیہ کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ رحمت کے ساتھ تربیت ملی ہوئی ہو یعنی ان کی خبر گیری کی جائے اور اپنا مال اور آرام ان کے لیے قربان کیا جائے۔ قرآن کریم میں فطرت انسانی کا کس قدر گہرا علم پایا جاتا ہے کہ اولاد کو یہ تاکید کی ہے کہ ان کے دلوں میں ماں باپ کے لیے رحم اور محبت ہو۔ والدین کو یہ نہیں کہا، اس لیے کہ وہ فطرت میں موجود ہے اور بغیر کسی حکم کے اپنا کام کر رہی ہے۔ ایسا ہی بڑھاپے میں ماں باپ سے نرمی سے پیش آنے میں یہی فطرت کا گہرا علم نظر آتا ہے۔

احادیث میں ماں باپ کے ساتھ نیکی پر اس قدر ترغیب دلائی ہے کہ جنت کو ماؤں کے قدموں کے نیچے قرار دیا ہے۔ گویا وہ ماں کی خدمت سے حاصل ہوتا ہے اور ایک حدیث میں ہے کہ والدین کی رضا اللہ تعالیٰ کی رضا ہے اور ان کی ناراضگی اس کی ناراضگی اور ماں باپ کی خدمت کو جہاد کی طرح قرار دیا ہے اور ایک حدیث میں ہے کہ ان کی موت کے بعد بھی ان سے نیکی کرے اور اس کی تفصیل یوں بیان فرمائی ہے کہ ان کے لیے دعا اور استغفار کرے اور ان کے بعد ان کے عہد کا ایفا کرے اور صلہ رحمی کرے اور ان کے دوست کا اکرام کرے۔

1823 - تَبْذِیْر۔ بَذْرٌ وہ دانہ ہے جو بیج کے لیے محفوظ رکھا جائے اور راغب کہتے ہیں کہ تَبْذِیْر مال کو ضائع کرنا ہے کیونکہ بیج کا ڈالنا بھی

اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ؕ وَ كَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾

مال اُڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکر گزار ہے۔ (1824)

وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّیْسُوْرًا ﴿۲۸﴾

اور اگر تو اپنے رب کی رحمت چاہتا ہے جس کی تجھے امید ہے ان سے منہ پھیر لے تو ان سے نرمی کی بات کہہ دے۔ (1825)

بظاہر اس شخص کو مال ضائع کرنے کی طرح معلوم ہوتا ہے جو اس کے مآل سے ناواقف ہے (یا اس لیے کہ اس کا بے جا پھینکنا اس کا ضائع کرنا ہے)۔

ماں باپ کے حقوق کے بعد قریبیوں، پھر مساکین، پھر مسافروں کے حقوق کی طرف توجہ دلائی ہے اور حَقَّهٗ کہہ کر یہ بتایا کہ ہر انسان کے مال میں اس کے قریبیوں اور مساکین اور مسافروں کا بھی کچھ حق ہے۔ اور اس کی تَبْذِیْر یعنی بے جا مال خرچ کرنے سے روک کر یہ سمجھایا کہ مال کو جب تم صحیح موقعہ پر خرچ کرتے ہو تو وہ ایک بیج کی طرح ہے جو زمین میں پڑتا اور پھل لاتا ہے۔ لیکن جو بیج بے موقعہ پھینکا جائے گا وہ ضائع ہو گیا۔ اس میں مال کی حفاظت کس قدر سکھائی ہے۔ مگر اس کی محبت کی تعلیم قرآن شریف نہیں دیتا اور یہی اس کا کمال ہے۔ اس رکوع کی تعلیم خلاصۃً سورۃ الانعام کے رکوع 19 میں آ چکی ہے۔ وہاں سارے رکوع کا خلاصہ صرف دو جملوں میں ہے ﴿اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا﴾ [الأنعام: 151:6] ''تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو۔'' یہاں والدین کے ساتھ احسان کو پہلے تفصیل سے بیان کیا پھر قریبیوں، مسکینوں وغیرہ سے احسان کی تعلیم دی۔ گویا بتایا کہ ماں باپ سے جب انسان نیکی کرتا ہے پھر دوسروں سے بھی نیکی کی توفیق ملتی ہے۔ گویا وہ پہلی نیکی ہے جس سے اور نیکیوں کی طرف قدم اٹھتا ہے۔

1824 - ﴿اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ﴾ اَخّ دین یا معاملہ یا محبت کے شریک پر بھی بولا جاتا ہے۔ [دیکھو نمبر: 283]۔ یہاں مراد بری صفات میں ان کے مماثل یا ان کے دوست ہیں۔ كَفُوْرًا کا لفظ لا کر بتایا کہ نعمت کو بے جا طور پر خرچ کرنا بھی کفران نعمت ہے۔ اسی طرح اس کو برمحل خرچ کرنا اس کا شکر ہے اور برمحل خرچ نہ کرنا کفران ہے۔ ناشکری کو شیطان کی صفت قرار دے کر ہر ناشکر گزار کو شیطان صفت قرار دیا۔

1825 - مَّیْسُوْر۔ یُسْرٌ سے ہے [دیکھو نمبر: 1561]۔ اور میسور کے معنی سہل ہیں اور یہ اسم مفعول ہے یُسِّرَ الْاَمْرَ سے اور یا مصدر ہے اور مبالغہ کے لیے بطور صفت استعمال ہوا ہے۔

اعراض یا منہ پھیر لینے سے مراد ہے کہ مسکین وغیرہ کو کچھ دینے کی استطاعت نہ ہو تو ایسی صورت میں سختی سے انہیں رد نہ کر۔ نرمی سے کلام کرنا بھی ایک صدقہ ہے اور ﴿اِبْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ﴾ اس لیے بڑھایا کہ نیت انسان کی بہرحال یہی ہو کہ اللہ

وَ لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَ لَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿۲۹﴾

اور اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ اور نہ اسے حد سے زیادہ کھول ورنہ تو ملامت کیا ہوا، درماندہ ہو کر بیٹھ رہے گا۔ (1826)

اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۳۰﴾ ع

تیرا رب جسے چاہتا ہے رزق کی فراخی دیتا ہے اور وہی تنگ کرتا ہے کیونکہ وہ اپنے بندوں سے خبردار (انہیں) دیکھنے والا ہے۔

تعالیٰ اسے ذرا وسعت دے تو وہ دوسروں کو بھی دے گا۔

1826 - ﴿مَلُوْمًا﴾۔ لَوْمَ ملامت کرنا اور لَآئِمٍ ملامت کرنے والا، ﴿لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾ [المآئدۃ: 54:5] ''کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔'' مَلُوْمٌ اور ملامت کیا گیا اور اَلَامَ کے معنی ہیں وہ ملامت کا مستحق ہوا۔ جس سے مُلِيْمٌ ہے ﴿فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ﴾ [الصافات: 142:37] ''سو مچھلی نے اسے لقمہ بنایا اور وہ اپنے آپ کو ملامت کرنے والا تھا۔''

خرچ میں میانہ روی:

ہاتھ کے بندھا ہوا ہونے یا گردن سے بندھا ہوا ہونے سے مراد بخل کرنا ہے۔ دیکھو مَغْلُوْلَةُ الْيَدِ [دیکھو نمبر: 850]۔ اور اس کے کھولنے سے مراد اسراف ہے۔ جب انفاق کی نصیحت کی اور اس کے بعد تنگ دستی کی حالت کا ذکر کیا تو اب خرچ کرنے کا ایک عام اصول بھی بتا دیا کہ مال کے خرچ کرنے میں نہ تو انسان بخیل ہو کیونکہ بخیل خدا کی راہ میں بھی نہیں دے سکتا اور نہ فضول خرچ ہو۔ کیونکہ فضول خرچ کے پاس خدا کی راہ میں دینے کے لیے کچھ باقی نہیں رہتا۔ اور حدیث میں ہے [مَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ] (مسند أحمد، جلد7، صفحہ302، حدیث: 4269) جو شخص خرچ میں میانہ روی اختیار کرے وہ تنگ دست نہیں ہوتا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پس انداز کرنا یا کچھ بچاتے رہنا اسلام کی تعلیم کے خلاف نہیں بلکہ اس کا عین منشا ہے۔ اور بخل کا نتیجہ ملامت ہے اور اسراف کا درماندگی۔ اور خدا کی راہ میں سارا مال دے دینا بھی اسراف نہیں۔ اس لیے کہ وہ بے جا خرچ نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر کوئی ضروری خرچ نہیں۔ اور اگلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ فراخی اور تنگ دستی دونوں حالتوں میں میانہ روی کو نہ چھوڑنا چاہیے۔

وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ اِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝۳۱

اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے نہ مار ڈالو، ہم ہی انہیں رزق دیتے ہیں اور تمہیں (بھی) ان کا مار ڈالنا بڑی غلطی ہے۔ (1827)

وَ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَ سَآءَ سَبِيْلًا ۝۳۲

اور زنا کے قریب مت جاؤ، کیونکہ وہ بے حیائی کی بات ہے اور بری راہ ہے۔ (1828)

وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَ مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ؕ

اور اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ اور جو ظلم سے قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے ولی کو اختیار دیا ہے مگر وہ قتل میں زیادتی نہ کرے

1827 - پچھلے اور اس رکوع کی تعلیم سورہ الانعام کے رکوع 19 کی تعلیم ہے۔ سوائے اس کے کہ یہاں بسط ہے۔ وہاں بھی توحید کے مضمون کے ساتھ یہ اخلاقی نصائح بیان کی ہیں اور یہاں بھی۔ وہاں شرک سے روک کر پھر والدین سے احسان کی تاکید کی ہے اور یہ مضمون پچھلے رکوع میں آ چکا ہے۔ اب یہاں تفصیل سے اخلاقی تعلیم کا ذکر کیا ہے۔ پہلے رکوع میں دوسروں سے نیکی کی تعلیم ہے اور یہاں دوسروں سے بدی کرنے سے روکا ہے۔ گویا ایک میں دوسروں سے نیکی کرنے کا ذکر ہے۔ دوسرے میں ان کی حق تلفی سے روکا ہے اور یہ دونوں باتیں معاملات میں اخلاق کی تکمیل کرتی ہیں۔ موٹی موٹی باتین جن کا یہاں ذکر ہے قتل اولاد، فواحش یا زنا، قتل نفس، یتیم کا مال کھانے سے روکنا، ماپ اور تول اور عہد کا پورا کرنا ہیں۔ وہاں قتل اولاد کے ذکر میں ﴿مِنْ اِمْلَاقٍ﴾ آتا ہے یہاں ﴿خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ﴾ جس کے لیے [دیکھو نمبر: 1033]۔ اسی لحاظ سے وہاں ﴿نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ﴾ فرمایا یہاں ﴿نَرْزُقُهُمْ وَ اِيَّاكُمْ﴾ کیونکہ وہاں والدین واقعی مفلس ہیں اور یہاں افلاس کا خوف ہے۔ اور خِطْاً اور خِطَاء کے ایک ہی معنی ہیں [دیکھو نمبر: 105]۔ اور قتل اولاد سے مراد یہاں لڑکیوں کا زندہ گاڑنا نہیں کیونکہ وہ امرا اور بڑے لوگ جھوٹی غیرت سے کرتے تھے۔ بلکہ ان کو علم سے محروم رکھنا اور صحیح تربیت نہ کرنا ہے [دیکھو نمبر: 1033]۔

1828 - زنا کے قریب مت جاؤ یعنی اس کے مبادی سے بھی بچو اور یہی اسلام کا کمال ہے کہ صرف بدی سے روکتا نہیں بلکہ بدی سے بچنے کا طریق بھی بتاتا ہے اور پھر اس کے بدنتائج سے بھی آگاہ کرتا ہے۔ اور بدنتائج میں اس کا فاحشہ ہونا بیان کیا یعنی اس سے بے حیائی بڑھتی ہے اور اخلاق فاضلہ کا ستیاناس ہوتا ہے اور دوسرے اس میں اور بھی برائیاں ہیں۔ مثلاً نسب کا ضائع ہونا، فتنوں اور جنگ وجدل کا پیدا ہونا۔

اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴿۳۳﴾

اس لیے کہ اسے مدد دی گئی ہے۔[1829]

وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۪ وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۴﴾

اور یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ مگر اس (طریق) سے جو نہایت عمدہ ہے یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے اور عہد کو پورا کرو کیونکہ (ہر) عہد کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَ زِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۳۵﴾

اور جب تم ماپو تو ماپ کو پورا کرو اور سیدھی ترازو سے تولو، یہ بہتر اور انجام کار بہت خوبی کی بات ہے۔[1830]

1829 - **سزائے قتل میں اسراف:** یہاں نفس یا جان سے مراد کوئی خاص نفس نہیں بلکہ ہر ایک انسان کی جان کو اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا ہے اور ولی سے مراد وارث لیا گیا ہے۔ جب وارث نہ ہو تو سلطان اور وارث کا اسراف فی القتل یہ ہے کہ خود بخود ایک شخص کو قتل کر دے اور اس کی وجہ بتائی کہ وہ منصور ہے یعنی حکومت وقت اس کی مدد کرے گی اور وہی تحقیقات کرنے اور فیصلہ دینے کی مجاز ہے اور حکومت وقت کو بھی سزا کے طور پر قتل میں اسراف سے روکا ہے یعنی یہ کہ ایک کی جگہ کئی کو قتل کر دے۔ جیسے بعض ظالم حکام اپنے یا اپنے متعلقین میں سے کسی کے قتل پر شہروں کے شہر اڑا دیتے تھے اور گنہگاروں کے ساتھ بیگناہوں کو بھی تہہ تیغ کر دیتے ہیں اور جب سزائے قتل میں بھی گنہگار سے تجاوز کرنا جائز نہیں تو دوسری سزاؤں میں کہاں جائز ہو سکتا ہے۔ پس ضمناً سمجھایا ہے کہ سزاؤں کے وارد کرنے میں یہ مدنظر رکھا جائے کہ ملزم کو حد سے زیادہ سزا نہ دی جائے، نہ بیگناہوں کو گنہگاروں کے ساتھ ملایا جائے۔ جیسا کہ آج کل انتظام قائم رکھنے کی آڑ کے ماتحت مہذب گورنمنٹیں بھی کر گزرتی ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ جن اخلاق کی تعلیم قرآن شریف نے دی ہے انہیں آج تک کوئی مہذب سے مہذب گورنمنٹ نہیں پہنچ سکی۔

1830 - قِسْطَاسِ۔ قِسْطٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 389] اور قِسْطَاسٌ میزان یعنی ترازو کو کہتے ہیں اور میزان کی طرح اس سے عدل کرنا یا انصاف کرنا مراد لیا جاتا ہے۔ اور ﴿وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ﴾ کے معنی کیے ہیں کہ یہ اشارہ ہے کہ انسان اپنے تمام اقوال وافعال میں جن کا وہ قصد کرتا ہے عدل وانصاف کی رعایت رکھے۔ (غ) امام راغب نے اسے مادہ قسط کے نیچے بیان کیا ہے۔ لیکن اکثر کا خیال ہے کہ یہ رومی سے معرب ہے۔

وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۶﴾

اور اس کے پیچھے نہ لگ جس کا تجھے علم نہیں، کان اور آنکھ اور دل ان سب سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا۔ (1831)

وَ لَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَ لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿۳۷﴾

اور زمین میں اکڑتا ہوا نہ چل، کیونکہ نہ تو تُو زمین کو پھاڑ ڈالے گا اور نہ لمبائی میں پہاڑوں کو پہنچے گا۔ (1832)

اس رکوع میں سب نواہی کا ذکر ہے لیکن ایفائے عہد اور ماپ اور وزن کا پورا کرنا اوامر ہیں۔ اور غرض دونوں کی ایک ہے یعنی دوسروں کی حق تلفی سے روکنا۔ ایفائے عہد نہ کرنا بھی دوسروں کی حق تلفی ہے اور ماپ تول کو پورا نہ کرنا بھی۔ اور جیسا کہ لفظ کی تشریح میں گزرا ماپ تول کے پورا کرنے سے مراد صرف ترازو وغیرہ نہیں بلکہ تمام معاملات میں عدل و انصاف کا برتاؤ ہے۔ یورپ کی موجودہ تہذیب نے عیسائیت میں اپنے معراج پر پہنچ کر دو میزانیں رکھی ہیں۔ مسلمانوں اور ایشیائی اقوام کے لیے اصول انصاف اور ہیں، یورپ کی وحشی سے وحشی قوم کے لیے اور۔ پھر ایک قوم سے معاملہ میں لینے کے بٹے اور ہیں دینے کے اور۔

1831 - ﴿تَقْفُ﴾۔ قَفَا گردن کے پچھلے حصہ کو کہتے ہیں اور قَفَوْتُهٗ کے معنی ہیں اس کے قَفَا کو پہنچا اور اِقْتِفَاءٌ قَفَا کا اتباع ہے اور اس سے کنایۃً کسی کے پیچھے اس کی بدگوئی کرنا اور عیب جوئی مراد لی جاتی ہے اور لَا تَقْفُ میں معنی ہیں قیافہ اور ظن سے کام نہ لو۔ اور قَيَافَةٌ اِقْتِفَاءٌ سے مقلوب ہے۔ (غ)

جب دوسروں کی ہر قسم کی حق تلفی سے روکا تو اب ایک اور بات سے بھی روکا جس سے بڑی بڑی بداخلاقیاں پیدا ہوتی ہے یعنی دوسروں کی بدگوئی یا عیب جوئی یا بغیر سننے اور دیکھنے کے ایک بات کا دیکھا اور سنا ہوا بیان کرنا۔ یہی اکثر ان بداخلاقیوں کی جڑ ہے جو اکثر مجلسوں میں رواج پا جاتی ہیں۔

1832 - ﴿مَرَحًا﴾۔ مَرَحٌ شدت فرح کا نام ہے جو اندازہ سے گزر جائے اور اکڑ بازی اور متکبرانہ روش کو بھی کہتے ہیں ﴿ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ ۝﴾ [المؤمن: 75:40] ''یہ اس لیے ہے کہ تم زمین میں ناحق خوش ہوتے تھے اور اس لیے کہ تم اتراتے تھے۔'' (ل)

جب ہر ایک قسم کی دوسروں کی حق تلفی اور عیب گیری سے روکا تو آخر پر یہ بھی بتایا کہ بعض افعال ایسے ہوتے ہیں کہ گو ان میں دوسروں کی حق تلفی نہ ہو مگر ان کے کرنے سے انسان خود اخلاق فاضلہ سے محروم رہ جاتا ہے اور یہ انسان کی متکبرانہ روش ہے اور مشی یا چلنے سے مراد صرف چلنا نہیں بلکہ ہر قسم کی روش ہے کہ اس میں انسان تکبر اختیار نہ کرے۔ گو اس کی سب سے موٹی مثال

كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴿۳۸﴾

ان سب کی برائی تیرے رب کے ہاں ناپسندیدہ ہے۔

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِىْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾

یہ ان حکمت کی باتوں میں سے ہیں جو تیرے رب نے تیری طرف وحی کیں اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ ٹھہرا ورنہ تُو ملامت کیا گیا دھتکارا ہوا ہو کر جہنم میں ڈالا جائے گا۔ (1833)

اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَ اتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾ ع 4 10 4

تو کیا تمہارے رب نے تمہیں بیٹوں کے لیے چن لیا ہے اور خود فرشتوں کو بیٹیاں بنایا، یقیناً تم بڑا بول بولتے ہو۔ (1834)

وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِىْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ؕ وَ مَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۱﴾

اور یقیناً ہم نے اس قرآن میں طرح طرح کے پیرائے اختیار کیے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں اور یہ بات (بھی) ان کی نفرت ہی بڑھاتی ہے۔ (1835)

اکڑ کر چلنا ہے۔ اس سے انسان کو حاصل کچھ نہیں ہوتا اور محروم بہت چیزوں سے ہو جاتا ہے۔ اور اگلی آیت میں رَبِّكَ کا لفظ لا کر بتا دیا کہ ان تمام باتوں سے انسان کی اپنی تربیت میں نقصان ہوتا ہے۔

1833 - ﴿اَوْحٰٓى اِلَيْكَ﴾ فرمایا حالانکہ خطاب عام ہے۔ کیونکہ وحی فی الحقیقت ہر ایک کی طرف ہے۔ گو وہ اسے رسول کی وساطت سے پاتا ہے اور اسے حکمت کہا اس لیے کہ اعلیٰ درجہ کی مضبوط اور دانائی کی باتیں ہیں۔

1834 - سب اخلاق فاضلہ کی تعلیم کے بعد پھر اصل الاصول یعنی توحید کی طرف توجہ دلائی جیسا کہ پچھلی آیت کے آخری حصہ سے ظاہر ہے اور اس آیت میں عرب کے ایک موٹے قسم کے شرک کا ذکر کیا کہ یہاں تک ان کا شرک ترقی کر گیا ہے کہ اس بات کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں جسے خود اپنے لیے بھی ناپسند کرتے ہیں یعنی یہ کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں اور یہ مضمون تفصیل کے ساتھ [النحل: 57-62] میں بیان ہو چکا ہے [دیکھو نمبر: 1753]۔

1835 - اخلاق فاضلہ کے مضمون کی ابتدا بھی توحید الٰہی سے کی تھی اور اس کے خاتمہ پر بھی اسی کا ذکر کیا اور اب اس رکوع میں ایمان

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾

کہہ اگر اس کے ساتھ (اور) معبود ہوتے جیسا یہ کہتے ہیں تو یہ ضرور عرش کے مالک کی طرف رستہ ڈھونڈ نکالتے۔ (1836)

سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿۴۳﴾

وہ پاک ہے اور جو کچھ یہ کہتے ہیں اس سے بہت ہی بلند ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَ اِنْ مِّنْ شَىْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۴﴾

ساتوں آسمان اس کی تسبیح کرتے ہیں اور زمین اور جو کوئی ان کے اندر ہیں (وہ بھی) اور کوئی چیز نہیں مگر اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔ وہ تحمل والا بخشنے والا ہے۔ (1837)

بالآخرۃ کے ذکر میں پھر اسی سے ابتدا کی اور بار بار اور طرح طرح کے پیرایوں میں اس مضمون کے بیان کرنے کی غرض بھی خود ہی بتادی کہ کسی طرح سے لوگ سمجھ لیں۔ ایک شخص ایک پیرایہ بیان سے فائدہ اٹھاتا ہے اور دوسرا دوسرے سے۔ اس لیے قرآن کریم نے اہم مضامین کو رنگ رنگ کے پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ مگر جو شخص دشمنی کی ہی ٹھان لیتا ہے اور وہ اور بھی دور بھاگتا ہے۔

1836- **مشرک مقرب بارگاہ الٰہی نہیں ہوسکتا:** مشرک قوموں کا بڑا عذر یہ ہوتا ہے اور یہی عرب کے بت پرستوں کا تھا کہ ہم بتوں کی یا اوروں کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا قرب اس ذریعہ سے حاصل کریں۔ فرمایا کہ اگر یہ درست ہوتا تو پھر ان کو خدائے برتر کا قرب حاصل ہوجانا چاہیے تھا۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی راہوں پر اطلاع پالیتے۔ تو اس صورت میں وحی الٰہی کے پانے والے نبوت اور رسالت کے مقام پر کھڑے ہونے والے بھی مشرک ہوتے نہ کہ موحد۔ حالانکہ جتنے اس قسم کے انسان تاریخ میں نظر آتے ہیں جو نبوت اور رسالت کے مقام پر کھڑے کیے گئے ہوں وہ سب موحد ہی ہوئے ہیں اور یا مراد یہ ہے کہ اگر یہ خدا تعالیٰ کے مقرب ہوتے تو پھر اسلام کی مخالفت میں کامیاب ہوجاتے۔ اور بعض نے سبیل سے مراد سبیل مغالبتہ اور ممانعت لیا ہے یعنی وہ معبود کوشش کرکے خدا پر غالب آجاتے۔ جیسا کہ دوسری جگہ ہے ﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ [الأنبیآء: 22:21] ''اگر ان دونوں میں اللہ کے سوائے (کوئی اور) معبود ہوتا تو دونوں بگڑ جاتے۔''

1837- **کل مخلوق کی تسبیح سے مراد:** یہ تسبیح جس کا یہاں ذکر ہے زبان حال سے ہے۔ (ر) اور یہ خود ﴿لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ سے ظاہر ہے۔ کیونکہ زبان کی تسبیح کو وہ بھی سمجھتے تھے اور مطلب یہ ہے کہ ہر ایک مخلوق اپنے خالق کے وجود پر گواہی دیتی ہے اس

وَ اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَیْنَكَ وَ بَیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۙ﴿۴۵﴾

اور جب تُو قرآن کو پڑھتا ہے تو ہم تیرے اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے ایک چھپا ہوا پردہ حائل کر دیتے ہیں۔ (1838)

وَّ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ یَّفْقَهُوْهُ وَ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَ اِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِی الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿۴۶﴾

اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں تاکہ وہ اسے نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں بوجھ (ڈال دیا ہے) اور جب تو قرآن میں اپنے اکیلے رب کا ذکر کرتا ہے اپنی پیٹھیں پھیرتے ہوئے بدک کر چل دیتے ہیں۔

لیے کہ ہر مخلوق ایک قید اور ایک دائرہ اور ایک حد بست کے اندر ہے اور معرض زوال میں ہے۔ لیکن خالق یا معبود مقید یا محدود اور زوال پذیر نہیں۔ کیونکہ مقید اور محدود ہونا یا معرض زوال میں ہونا ایک عیب ہے۔ پس عملی رنگ میں تمام چیزیں مقید اور محدود اور معرض زوال میں ہو کر ایک خالق کے وجود پر شہادت دیتی ہیں جو دوسری چیزوں کو اندازوں اور حد بست کے اندر رکھنے والا اور خود لازوال ہے اور یہی تسبیح ہے کہ وہ ان تمام عیوب سے پاک ہے جو مخلوق کے لاحق حال ہیں۔ اور شرک کی تردید اس سے ہوتی ہے۔ اس لیے کہ جن کو خدا کے شریک بنایا جاتا ہے وہ سب مخلوقیت کی مہر اپنے اوپر رکھتے ہیں۔ حلم وغفر کی صفات آخر پر لا کر یہ بتایا کہ جو لوگ اس کو چھوڑتے ہیں ان پر فوراً عذاب نازل نہیں کرتا۔ چنانچہ انہی لوگوں کا ذکر اگلی آیت میں ہے۔

1838 - ﴿حِجَابًا﴾۔ حَجَبَ اور حجاب کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف پہنچنے سے روک دینا اور ایسی روک بھی۔ اور اہل جنت اور اہل نار کے درمیان جس حجاب کا ذکر ہے ﴿وَ بَیْنَهُمَا حِجَابٌ﴾ [الأعراف: 46:7] ''اور ان کے درمیان ایک پردہ ہوگا'' تو وہ ایسا پردہ نہیں جو نظر کو روکتا ہے بلکہ ایسا پردہ جو اہل جنت کی لذات کو اہل نار کو پہنچنے سے اور اہل نار کی اذیت اہل جنت کو پہنچنے سے روکتا ہے۔ (غ) اور یہاں تو خود ہی اس حجاب کو مَّسْتُوْر بھی کہہ دیا ہے یعنی وہ ایسا پردہ ہے جو آنکھ سے نظر نہیں آتا۔

اللہ تعالیٰ دلوں پر کیوں پردہ ڈالتا ہے:

اس آیت میں حجاب کے حائل کرنے اور اگلی میں دلوں پر پردے ڈالنے کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے جس کے متعلق مفصل بحث گزر چکی [دیکھو نمبر: 18] یہ پردے اس لیے ڈال دیئے جاتے ہیں کہ وہ خود سننا اور سمجھنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ یہاں بھی آیت 41 میں بتایا کہ ہم تو طرح طرح کے پیرایوں میں باتوں کو بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں مگر ان کی نفرت اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اور آیت 46 میں نفرت کو صاف الفاظ میں ان کی طرف منسوب کیا کہ جب ایک خدا کا ذکر ہوتا ہے تو وہ اس کے سننے کی برداشت ہی نہیں کر سکتے ﴿وَ اِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِی الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿۴۶﴾﴾ اور اسی کے مطابق دوسری جگہ اور بھی صفائی سے فرمایا ﴿وَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَ اِذَا ذُكِرَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَ اِذْ هُمْ نَجْوٰٓى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۴۷﴾

ہم خوب جانتے ہیں جیسا وہ سنتے ہیں جب تیری طرف کان لگاتے ہیں اور جب یہ خفیہ مشورہ کرتے ہیں، جب ظالم کہتے ہیں کہ تم صرف ایک جادو کیے ہوئے مرد کی پیروی کرتے ہو۔ (1839)

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۴۸﴾

دیکھ کس طرح تیرے لیے مثالیں بیان کرتے ہیں۔ سو یہ گمراہ ہو گئے اور راستہ نہیں پا سکتے۔ (1840)

اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۵﴾ [الزمر: 45:39] ''اور جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دل نفرت کرتے ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے۔ اور جب ان کا ذکر کیا جاتا ہے جو اس کے سوائے ہیں، تو وہ خوش ہوتے ہیں۔'' پس توحید الٰہی کا ذکر سنتے ہی ان کے دل گھٹ جاتے پھر سمجھنا کیا تھا۔ یہی وہ پردے ہیں جو حائل ہو جاتے تھے۔ اور آیت 47 میں اور بھی بات کو واضح کیا ہے کہ وہ کچھ سنتے بھی ہیں تو صرف اس نیت سے کہ ان باتوں پر ہنسی اڑائیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ قرآن کریم اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔ دوسری جگہ قرآن کریم میں ہے ﴿وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَ فِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّ مِنْۢ بَيْنِنَا وَ بَيْنِكَ حِجَابٌ﴾ [حٰمٓ السجدة: 5:41] وہ خود کہتے تھے کہ ہمارے دل پردوں میں ہیں اور ہمارے کانوں میں بوجھ ہے اور ہمارے اور تمہارے درمیان حجاب ہے۔ اسی بات کو یہاں اس دوسرے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس آیت میں آخرت پر ایمان نہ لانے والوں کا ذکر کر کے بتایا کہ وہ توحید حقیقی سے بھی محروم رہ جاتے ہیں۔ گویا ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ ایک دوسرے سے ایسے وابستہ ہیں کہ ایک کا انکار دوسرے کا بھی انکار ہے۔

1839 - مَّسْحُوْر۔ سَحَر غذا یا طعام کو کہتے ہیں اور سَحر دھوکہ یا وہ چیزیں جن کا ماخذ دقیق ولطیف ہو اور مُسَحَّر اور مَّسْحُوْر کے دونوں طرح معنی ہو سکتے ہیں یعنی سَحَر دیا گیا یا محتاج غذا یا کھاتا پیتا آدمی اور وہ جس کے لیے سِحْر کہا گیا ہو یعنی جس کی باریکی سے وہ اس امر کی طرف پہنچتا ہے جس کا وہ دعویٰ کرتا ہے۔ (غ) گویا مراد اس سے ساحر ہی ہوا۔ اور پہلے معنی ابن جریر نے بھی نقل کیے ہیں اور ان کی صحت پر اشعار عرب سے سند دی ہے۔ (ج) اور بعض نے مَّسْحُوْر بمعنی ساحر بھی لکھا ہے۔ (ر) گویا آپ کو چالباز یا دھوکہ دینے والا کہا۔ نَجْوٰى کے لیے [دیکھو نمبر: 731]۔

﴿يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ﴾ میں یا تو مراد ہے جس چیز کو ساتھ لیے ہوئے سنتے ہیں یعنی استخفاف ہنسی وغیرہ اور یا لِاَجْلِهٖ سے مراد ہے یعنی جس نیت استہزا وغیرہ سے سنتے ہیں۔ اور پھر یہی نہیں بلکہ آنحضرت ﷺ کے خلاف مشورے کرتے ہیں۔

1840 - **آنحضرت ﷺ کے متعلق مختلف رائیں:** ﴿ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ﴾ یا مثالیں بیان کرنے سے مراد ہے کہ کن کن سے تمہیں تشبیہ دیتے ہیں۔ یعنی کبھی ساحر کہتے ہیں، کبھی استہزا کرتے ہیں اور مجنون کہتے ہیں، کبھی مفتری قرار دے کر منصوبے

وَ قَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۴۹﴾

اور کہتے ہیں کیا جب ہم ہڈیاں اور چورا ہو جائیں گے تو کیا نئی پیدائش کے لیے اٹھائے جائیں گے۔ (1841)

قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ﴿۵۰﴾

کہہ پتھر ہو جاؤ یا لوہا۔

اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ؕ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ؕ قُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ﴿۵۱﴾

یا کوئی اور مخلوق جو تمہارے دلوں میں بڑی (سخت) معلوم ہوتی ہے۔ پس کہیں گے ہمیں کون لوٹائے گا۔ کہہ جس نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے۔ تب وہ تیرے سامنے اپنے سر ہلائیں گے اور کہیں گے یہ کب ہوگا؟ کہہ شاید قریب ہی ہو۔ (1842)

کرتے ہیں اور گمراہ ہونے اور راستہ نہ پانے سے اسلامی صداقتوں کا انکار بھی مراد ہو سکتا ہے۔ اور یہ بھی کہ آنحضرت ﷺ کے معاملہ میں یہ بھٹک رہے ہیں اور کوئی مخرج نہیں ملتا کہ کیا ایک رائے قائم کریں۔ اس لیے کوئی کچھ کہتا تھا کوئی کچھ، اور ایک دوسرے کو خود ہی جھٹلا دیتے تھے۔ یہی حالت مخالفین اسلام کی آج بھی ہے اور یا مثالیں بیان کرنے سے مراد انکار بعث وغیرہ کی باتیں ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

1841 - ﴿رُفَاتًا﴾۔ رَفَتٌ کے معنی ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ہیں اور رفات وہ چیز ہے جو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پراگندہ کر دی جائے۔ (غ)

1842 - يُنْغِضُوْنَ۔ اَنْغَاضَ دوسرے کی طرف سر کا ہلانا ہے۔ گویا کہ اس کی بات پر تعجب کرنا ہے۔ (غ) اور یہ اوپر نیچے ہلانا ہوتا ہے یا انکار کے طور پر ہلانا۔ (ل)

بعث بعد الموت مادہ پرستوں کے لیے ہمیشہ ہی تعجب کا مقام رہا ہے۔ انکار کے رنگ میں کہتے ہیں کہ ہم مر جائیں گے اور گوشت گل سڑ کر ہڈیاں رہ جائیں گی اور آخر وہ ہڈیاں بھی چورا ہو جائیں گی تو کیا پھر ہم از سر نو زندہ کیے جائیں گے۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ چورا اور مٹی تو آسانی سے زندگی قبول کر لیتی ہے۔ اگر تم ایسی چیز بھی بن جاؤ کہ جو زندگی قبول ہی نہیں کر سکتی جیسے پتھر یا لوہا یا اس سے بھی زیادہ سخت کوئی چیز جو تمہارے خیال میں آ سکتی ہو تب بھی موت کے بعد تم زندہ ہو گے اور آگے چل کر فرمایا کہ تم چورا چورا ہو جاؤ گے تو وہ تمہاری مثل پیدا کر دے گا۔ [دیکھو نمبر: 99] کیونکہ وہ زندگی اعمال انسانی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اس پیرایہ کے اختیار کرنے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اگر تمہارے دل پتھر اور لوہے کی طرح بھی سخت ہو جائیں تو بھی اللہ تعالیٰ اس دنیا میں بھی تمہیں ایمان کی توفیق دے دے گا اور شاید قَرِيْبًا میں اسی طرف اشارہ ہو۔ اور اگلی آیت میں حمد کے ساتھ فرمانبرداری کرنا اسی کا مؤید ہے۔ گویا اس بعثت کبریٰ سے پیشتر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کا نظارہ ایک بعثت صغریٰ میں بھی دکھا دے گا۔

يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَ تَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۵۲﴾

جس دن وہ تمہیں بلائے گا تب تم اس کی حمد کرتے ہوئے فرمانبرداری کرو گے اور جان لو گے کہ تم تھوڑا ہی رہے۔

وَ قُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿۵۳﴾

اور میرے بندوں کو کہہ دے وہ (بات) کہیں جو بہت اچھی ہے شیطان ان میں فساد ڈلواتا رہتا ہے۔ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔[1843]

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ؕ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ؕ وَ مَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۵۴﴾

تمہارا رب تمہیں خوب جانتا ہے اگر وہ چاہے تم پر رحم کرے اور اگر چاہے تمہیں عذاب دے اور ہم نے تجھے ان کا ذمہ دار (بنا کر) نہیں بھیجا۔

وَ رَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۵۵﴾

اور تیرا رب انہیں خوب جانتا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور یقیناً ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی اور داؤد کو ہم نے زبور دی۔[1844]

1843 - عین اس وقت جب کفار کی طرف سے سخت تکلیفیں پہنچ رہی تھیں آنحضرت ﷺ پر استہزا ہوتا۔ آپ کو ساحر، کاہن، مفتری، شاعر کہا جاتا تھا۔ مسلمانوں کو آیات بالا میں یہ خوشخبری سنا کر کہ یہ بھی ایک وقت اسلام قبول کریں گے یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ سب کچھ سن کر بھی اپنے مخالفین سے احسن طریق پر بات کریں اور ان سے خشونت نہ کریں۔ کیونکہ شیطان کی کوشش ہے کہ فساد بڑھائے۔ نَزَغُ کے لیے [دیکھو نمبر: 1195] اور سخت کلامی سے فساد اور بڑھے گا۔ کیا آج مسلمانوں کے لیے اس میں کوئی سبق نہیں۔ آج سے کم اس وقت مخالفین اسلام کی تباہی کے درپے نہ تھے۔ مگر حق اور صداقت دنیا میں صرف نرمی سے پھیل سکتے ہیں، بغیر درشتی برتنے کے بھی ہم بعض افعال سے اظہار نفرت کر سکتے ہیں جن کا ارتکاب آج عیسائی اقوام طاقت کے نشہ میں کر رہی ہیں۔ اگلی آیت میں يَرْحَمْكُمْ میں یہی اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اسلام میں داخل کر دے۔

1844 - **زبور کی خصوصیت:** بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دینے میں اشارہ آنحضرت ﷺ کی فضیلت کی طرف ہے [دیکھو نمبر: 324] اور یہاں سورت کی ابتدا ہی اس ذکر سے ہوتی ہے۔ جس میں یہ بتایا گیا کہ آپ کل انبیاء کے فضائل کو اپنے اندر جمع رکھتے ہیں اور

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَ لَا تَحْوِيْلًا ﴿۵۶﴾

کہہ انہیں پکارو جنہیں تم اس کے سوائے (معبود) خیال کرتے ہو تو وہ نہ تم سے تکلیف دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ بدل دینے کا۔ (1845)

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَ يَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴿۵۷﴾

وہ جنہیں یہ پکارتے ہیں ان میں سے وہ جو زیادہ قرب رکھتے ہیں خود اپنے رب تک پہنچنے کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں اور اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں تیرے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے۔ (1846)

کامیابی اور تقرب الٰہی کے بلند سے بلند مرتبہ پر جو انسان کے لیے ممکن ہے پہنچے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں اس فضیلت کی طرف اشارہ کر کے اس رکوع کے آخر پر پھر اسی رویائے معراج نبوی کا ذکر کیا۔ اور [آیت: 58] میں آپ کی بعثت عامہ کا ذکر اسی کی طرف اشارہ ہے اور حضرت داؤد علیہ السلام کو زبور دینے کا یہاں بالخصوص ذکر اس لیے کیا کہ ایک تو زبور میں شدت بہت ہے۔ اس کے مقابل قرآن کریم نے اسی جگہ اعدائے اسلام تک کے لیے ﴿يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ کی تعلیم دی ہے اور دوسرے جن کامیابیوں کی طرف اس سورت میں توجہ دلائی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مسجد اقصیٰ یعنی بیت المقدس بھی مسلمانوں کو دیا جائے گا اور یہ پیشگوئی خاص طور پر حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور میں ہی ہے ﴿وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۝﴾ [الأنبیآء: 105:21] ''اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔'' پس حضرت داؤد علیہ السلام اور زبور کا ذکر یہاں بے ربط نہیں بلکہ صاف بتاتا ہے کہ کس لطیف طریق پر سلسلہ مضمون کو قرآن کریم چلاتا ہے اور رکوعوں کے رکوع درمیان میں آ جانے کے بعد بھی کس طرح سورت کے اصل مضمون کو قائم رکھا ہے۔

1845 - ﴿تَحْوِيْلًا﴾۔ حَالَ سے ہے [نمبر: 720] اور ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف منتقل ہونا تَحَوُّلَ اور منتقل کرنا تحویل ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ وہ دکھ کو ان سے ہٹا کر دوسرے پر نہیں ڈال سکتے اور حِوَلَ اور تَحَوَّلَ کے ایک ہی معنی ہیں ﴿لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا﴾ [الکھف: 108:18] ''وہاں سے جگہ بدلنا نہیں چاہیں گے۔'' (غ)

1846 - وَسِيْلَةَ کے لیے [دیکھو نمبر: 820]۔ ابن جریر میں اس کی تفسیر میں ہے کہ اس کے معنی قرب ہی ہیں اور یہ معنی ابن عباس رضی اللہ عنہما

وَ اِنْ مِّنْ قَرْیَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِیْدًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِی الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴿۵۸﴾

اور کوئی بستی نہیں مگر ہم اسے قیامت کے دن سے پہلے ہلاک کر دیں گے یا اسے سخت عذاب دیں گے۔ یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے۔ (1847)

سے مروی ہیں۔

اَیُّهُمْ ۔ میں یا اَیّ موصولہ ہے اور یہ ضمیر یَبْتَغُوْنَ سے بدل کر بعض ہے یعنی جو ان میں سے مقرب ہیں وہ تو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے ساتھ اور بھی اس کے قرب کو چاہتے ہیں۔ اور یا اَیّ استفہامیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ کوشش کرتے ہیں کہ کون ان میں سے زیادہ قرب حاصل کرے۔

حصول قرب الٰہی کا ذریعہ:

یہاں کن معبودوں کا ذکر ہے۔ بعض کے نزدیک جن مراد ہیں اور بعض کے ملائکہ اور بعض کے عیسیٰ اور مریم اور عزیر۔ (ج) اور آخری بات ہی درست ہے۔ اس لیے کہ یہاں بذریعہ اعمال و طاعات کے قرب حاصل کرنے کا ذکر ہے۔ کیونکہ جنوں کے مقرب بارگاہ الٰہی ہونے کا قرآن شریف میں کہیں ذکر نہیں۔ اور ملائکہ مقرب تو ہیں مگر وہ طاعات اور اعمال سے قرب حاصل نہیں کرتے نہ ان کے مدارج قرب میں کوئی ترقی ہوتی ہے۔ پس مراد ایسے راستباز انسان ہی ہیں جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ اور سب سے بڑا شرک انہی کے متعلق ہونے والا تھا۔ اب بھی انجیل کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود عبادات اور دعائیں کرتے تاکہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کریں۔ خدا کو خدا کا قرب حاصل کرنے کی کیا ضرورت تھی اور اس کے عذاب سے ڈرنا، اس کے قانون کو توڑنے سے ڈرنا ہے ﴿اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۵﴾﴾ [الأنعام: 15:6] ''اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔'' خیر البشر کی زبان سے کہلوایا۔ پس قرب الٰہی کو حاصل کرنے کا وہی راستہ ہے جس پر چل کر ان راستبازوں نے قرب الٰہی حاصل کیا یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری کی جائے، نہ یہ کہ ان کی عبادت کی جائے۔ جو شخص کسی بزرگ کو مقرب بارگاہ الٰہی سمجھتا ہے اسے چاہیے کہ خود اسی راستہ پر چلے جس پر چل کر وہ بزرگ مقرب بنا، یہی سیدھی راہ ہے۔

1847- جب اوپر کی آیت میں بتایا کہ مقربین بارگاہ الٰہی بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں۔ تو اب بتایا کہ ان کو خدا بنانے والے کس طرح عذاب سے بچ سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ راستباز تو طاعات کی طرف قدم بڑھاتے تھے اور یہ ان کو خدا بنا کر معاصی پر دلیر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور ان کے غلط راہ پر ہونے کا یہ نشان ہے کہ ان پر عذاب آتے رہیں گے۔ اسی کے مطابق دوسری جگہ ہے ﴿وَ قَالَتِ الْیَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰی نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ یُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ﴾ [المآئدۃ: 18:5]

وَ مَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰیٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ وَ اٰتَیْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ وَ مَا نُرْسِلُ بِالْاٰیٰتِ اِلَّا تَخْوِیْفًا ﴿۵۹﴾

اور ہمیں کسی چیز نے نہیں روکا کہ نشان بھیجتے رہیں۔ مگر یہ (ہوا) کہ پہلے انہیں جھٹلاتے رہے اور ہم نے ثمود کو اونٹنی روشن (نشان کے طور پر) دی، سو انہوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم نشان صرف ڈرانے کو بھیجتے ہیں۔ (1848)

''اور یہودی اور عیسائی کہتے ہیں ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔ کہہ پھر تمہارے گناہوں کی وجہ سے تمہیں کیوں عذاب دیتا ہے۔'' اور یہاں حصر کیا ہے کہ قیامت سے پہلے ہر ایک بستی کو یا ہم ہلاک کر دیں گے یا سخت عذاب دیں گے اور اس کے کتاب میں لکھا ہونے سے یہ مراد ہے کہ علم الٰہی میں یہ بات ہے جس کو اب قرآن شریف میں ظاہر کیا گیا۔ ان الفاظ سے خود قیامت کا آنا مراد نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ پھر ہلاکت اور سخت عذاب کو علیحدہ علیحدہ بیان نہ کیا جاتا۔ قیامت کے آنے پر تو ہلاکت ہی ہلاکت ہوگی اور خود زمین ہی پاش پاش کر دی جائے گی۔ پس اس آیت میں ان امور کا ذکر ہے جو قیامت سے پیشتر آنحضرت ﷺ کے زمانہ نبوت میں وقوع میں آنے والے ہیں۔ اور ہلاکت سے مراد یہ ہے کہ بعض بستیاں بالکل تباہ کر دی جائیں گی۔ اور عذاب شدید سے مراد یہ ہے کہ ان پر طرح طرح کے مصائب بھیجے جائیں گے اور جیسا کہ دوسرے مقامات سے ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا عذاب لوگوں کی اصلاح کے لیے آیا کرتا ہے ﴿اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ ﴿۹۴﴾﴾ [الأعراف: 94:7] ''اس کے رہنے والوں کو سختی اور دکھ نے پکڑا تا کہ وہ عاجزی اختیار کریں۔'' اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پر سبقت لے گئی ہے۔ اس لیے ہلاکت کا عذاب کم ہی آتا ہے۔ بایں تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ بستیوں کی بستیاں دنیا سے بالکل نابود ہوگئیں اور یہ بھی سچ ہے کہ انسانوں کی ہر بستی کبھی نہ کبھی، کچھ نہ کچھ مزاطرح طرح کی بلاؤں کا چکھتی ہی رہتی ہے۔ اور یہ اس لیے ہوتا ہے کہ لوگ ظلم میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی سزا محض ان کی تنبیہ کے لیے اور ان کے معاصی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ﴿وَ كَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَ رُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِیْدًا ۙ وَّ عَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۸﴾ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَ كَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ﴿۹﴾﴾ [الطلاق: 65:8-9] ''اور کتنی بستیاں ہیں جنہوں نے اپنے رب کے حکم اور اس کے رسولوں سے سرکشی کی تو ہم نے اس کا حساب سختی سے لیا اور اسے سخت سزا سے عذاب دیا۔ تو انہوں نے اپنے کام کی سزا چکھی اور ان کے کام کا انجام گھاٹا ہی ہوا۔''

1848 - **قرآن معجزات کا انکار نہیں کرتا:** اس آیت کے معنی میں بسا اوقات یہ غلطی کی جاتی ہے کہ اس میں معجزات یا خاص قسم کے معجزات کا انکار مانا جاتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اب ہم نشان نہیں بھیجتے اس لیے کہ پہلے لوگوں نے ان کی تکذیب کر دی۔ اگر واقعی کسی کا تکذیب کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے روک ہوسکتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ سلسلہ رسل وانبیاء کو ہی بند کر دیتا۔ کیونکہ کون سا رسول آیا جس کی تکذیب نہیں ہوئی ﴿فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ﴾ [آل عمران: 184:3] ''پھر اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو تجھ سے پہلے بھی رسول جھٹلائے جا چکے ہیں۔'' ﴿یٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ

وَ اِذۡ قُلۡنَا لَکَ اِنَّ رَبَّکَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَ مَا جَعَلۡنَا الرُّءۡیَا الَّتِیۡۤ اَرَیۡنٰکَ اِلَّا فِتۡنَۃً لِّلنَّاسِ وَ الشَّجَرَۃَ الۡمَلۡعُوۡنَۃَ فِی الۡقُرۡاٰنِ ؕ

اور جب ہم نے تجھے کہا کہ تیرے رب نے لوگوں کو گھیر لیا ہے اور ہم نے اس رؤیا کو جو تجھے دکھایا صرف لوگوں کے لیے فتنہ بنایا اور اس درخت کو (بھی) جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے

یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ ﴿۳۰﴾ [یٰسٓ: 36:30] ''ہائے افسوس بندوں پر کوئی رسول ان کے پاس نہیں آتا مگر اس سے ہنسی کرتے ہیں۔'' اور یوں بھی یہ تو اللہ تعالیٰ پر اعتراض ہے کہ اسے پہلے علم نہ تھا کہ لوگ تکذیب کر دیں گے۔ جب لوگوں کے نشانات کی تکذیب کرنے سے یہ سمجھ آ گیا کہ نشانات کا بھیجنا بے سود ہے تو پھر اس نے ان کا بھیجنا بند کر دیا۔ بعض روایات میں جو اس آیت کی تفسیر میں ابن کثیر اور ابن جریر نے بیان کی ہیں، ان میں یوں آیا ہے کہ کفار نے کہا تھا کہ صفا پہاڑ سونا ہو جائے تو ہم مان لیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ایسا کر دوں گا لیکن اگر یہ پھر بھی نہ مانیں گے تو بالکل تباہ کر دیئے جائیں گے۔ جیسے پہلی امتیں ہلاک کر دی گئیں۔ تو آنحضرت ﷺ نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ میں ان کے معاملہ میں نرمی کی درخواست کرتا ہوں۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اس صورت میں گویا الۡاٰیٰتِ سے مراد وہ خاص نشان لیا جائے گا جو قریش نے مانگا اور ﴿ کَذَّبَ بِھَا ﴾ میں ضمیر ان نشانوں کی طرف نہیں بلکہ ان کی جنس کی طرف ہوگی۔ مگر اس توجیہہ کو آیت کے آخری الفاظ ﴿ وَمَا نُرۡسِلُ بِالۡاٰیٰتِ اِلَّا تَخۡوِیۡفًا ﴾ صحیح نہیں ٹھہراتے۔ کیونکہ صفا کا سونا بنانا تخویف کے لیے نہ تھا۔ اور علاوہ ازیں اگلی آیت میں نُخَوِّفُھُمۡ لا کر بتا دیا کہ جس طرح پہلے آیات تخویف کے لیے بھیجتے رہے ہیں اب بھی بھیج رہے ہیں۔ اور یہ دونوں باتیں صاف بتاتی ہیں کہ اس آیت میں کسی قسم کے معجزات کا بھی انکار نہیں۔ اور سیاق مضمون بھی صاف یہی بتاتا ہے کہ یہاں انکار آیات نہیں کیونکہ اس سے پچھلی آیت میں صراحت کے ساتھ بیان فرمایا تھا کہ ہم عذاب ہلاکت یا دوسرے عذاب دنیا میں بھیجتے رہیں گے اور اگلی آیت میں بھی عذاب بھیجنے کا ذکر ہے۔ پس اِلَّا کو استثنائے منقطع لے کر آیت کے معنی یوں ہوں گے کہ کسی چیز نے بھی ہمیں نشانوں کے بھیجنے سے نہیں روکا۔ ہاں دوسری طرف یہ بھی ہوتا رہا کہ جن کے لیے یہ نشان بھیجے گئے تھے کہ وہ ان سے سبق حاصل کریں انہوں نے نشانات کی تکذیب کی۔ اور آیات تخویف کے لیے بھیجی جاتی ہیں یعنی ہلاکت سے کم تر عذاب اس لیے بھیجے جاتے ہیں کہ لوگ ڈر کر رجوع کریں۔

اور درمیان میں ثمود کو ناقہ دینے کا ذکر بطور جملہ معترضہ کیا ہے اور یہ گویا ان آیات کی ایک مثال ہے۔ یعنی اس اونٹنی کو بھی بطور ایک نشان کے انہیں دیا گیا تھا۔ سو اس پر انہوں نے ظلم کیا۔ اس اونٹنی کا خصوصیت سے ذکر کرنے کی کیا وجہ ہے؟ تباہ شدہ قوموں میں اہل حجاز سے قریب ترین قوم ثمود ہی تھی جو الحجر میں مدینہ کے شمال میں آباد تھی اور جو کچھ منصوبہ حضرت صالح علیہ السلام کے اعدا نے صالح علیہ السلام کے خلاف کیا بعینہ وہی منصوبہ نبی کریم ﷺ کے اعدا نے آپ کے خلاف کیا ﴿ قَالُوۡا تَقَاسَمُوۡا بِاللّٰہِ لَنُبَیِّتَنَّہٗ وَ اَہۡلَہٗ ثُمَّ لَنَقُوۡلَنَّ لِوَلِیِّہٖ مَا شَہِدۡنَا مَہۡلِکَ اَہۡلِہٖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوۡنَ ﴿۴۹﴾ ﴾ [النمل: 27:49] ''انہوں نے کہا اللہ کی قسم کھاؤ کہ ضرور

وَ نُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ﴿٦٠﴾

اور ہم انہیں خوف دلاتے ہیں تو اس سے ان کی خطرناک سرکشی اور بڑھتی ہے۔ (1849)

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ﴿٦١﴾

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو تو انہوں نے فرمانبرداری کی مگر ابلیس (نے نہ کی) کہا کیا میں اس کی فرمانبرداری کروں جسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔

ہم اس پر اور اس کے اہل پر رات کے وقت حملہ کریں گے پھر ہم اس کے ولی کو کہہ دیں گے ہم اس کے گھر والوں کی ہلاکت پر موجود نہ تھے اور ہم بالکل سچے ہیں۔'' اور بعینہٖ ایسا ہی منصوبہ نبی کریم ﷺ کے خلاف ہوا تھا۔ حالانکہ وہ سورت اس منصوبہ سے بہت پہلے کی ہے اور ثمود کا اونٹنی کو مارنا حضرت صالح علیہ السلام کے قتل کا پیش خیمہ تھا۔ اور شاید یہ بھی اس میں مدنظر ہو کہ وہ بھاگ نہ سکیں۔

1849 - ﴿اَحَاطَ بِالنَّاسِ﴾ اَحَاطَةٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 1387]۔ یہاں مراد قدرت کے ساتھ احاطہ کرنا ہے اور [اُحِيْطَ بِفُلَانٍ] سے مراد ہوتی ہے اس کی ہلاکت قریب آ گئی۔

الرُّءْيَا خواب کے ساتھ مخصوص ہے [دیکھو نمبر: 1516 ج]۔ اور اس رؤیا سے مراد معراج ہے جیسا کہ بخاری اور دیگر کتب حدیث سے ثابت ہے۔ لیکن یہاں جو مفسرین نے اسے رؤیا عین کہا ہے تو یہ صریحاً لغت کے خلاف ہے اور اس لیے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ مفصل [نمبر: 1801] میں گزر چکا۔

﴿الشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ﴾ سے مراد زقوم کا درخت لیا گیا ہے اور یہ معنی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں اور مَلْعُوْنَةَ اسے اس لیے کہا کہ اس کے کھانے والے ملعون ہوں گے۔ لیکن [دیکھو نمبر: 55] اباء و استکبار کی وجہ سے جسے قرآن شریف میں ایک شجرۃ ہی قرار دیا گیا ہے شیطان ملعون ہوا اور خود بدی کو ﴿كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةٍ﴾ [ابراھیم: 26:14] ''گندے درخت کی طرح ہے۔'' کہا ہے۔

رؤیائے معراج:

رکوع کی آخری آیت میں صاف طور پر سورت کے اصل مضمون کی طرف پھر متوجہ کیا اور اس رویا کا ذکر کیا ہے جس سے سورت کی ابتدا کی تھی اور پہلے بلحاظ سیاق مضمون بتایا کہ جو مخالف اپنے آپ کو بڑا طاقتور سمجھتے ہیں وہ سب اللہ کی گرفت میں ہیں اور ہلاک کر دیئے جائیں گے۔ اور بعض مفسرین نے یہاں اشارہ بالخصوص بدر کی طرف مانا ہے اور پھر رویائے معراج کا ذکر کیا ہے جس میں نبی کریم ﷺ کی آئندہ کامیابیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور پھر ملعون درخت کا یعنی زقوم کا درخت جو دوزخیوں کا طعام

قَالَ اَرَءَيۡتَكَ هٰذَا الَّذِىۡ كَرَّمۡتَ عَلَىَّ لَئِنۡ اَخَّرۡتَنِ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ لَاَحۡتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۶۲﴾

کہا، بتا جسے تو نے مجھ پر بزرگی دی ہے اگر تو مجھ کو قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں ضرور سوائے تھوڑوں کے اس کی نسل کو قابو میں کرلوں گا۔(1850)

قَالَ اذۡهَبۡ فَمَنۡ تَبِعَكَ مِنۡهُمۡ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمۡ جَزَآءً مَّوۡفُوۡرًا ﴿۶۳﴾

فرمایا چلا جا جو کوئی ان میں سے تیری پیروی کرے گا تو دوزخ تمہاری سزا ہے (اور) پوری سزا ہے۔(1851)

ہوگا اور اس میں اشارہ مخالفوں کی سزا دہی کی طرف ہے اور یا بدی کا درخت یا اباء واستکبار کا درخت کہ اسی سے ڈرانا مقصود ہے اوران دونوں کو ﴿فِتْنَةً لِّلنَّاسِ﴾ فرمایا ہے۔ رویا کا فتنہ ہونا تو اس لحاظ سے کہ لوگوں کے لیے ابتلا اور امتحان کا موجب ہوگئی۔ اور ملعون درخت سے اگر زقوم مراد لیا جائے تو اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ یہ سن کر کہ قرآن شریف نے دوزخیوں کی خوراک زقوم بتائی ہے ابوجہل نے کھجوریں اور مکھن منگوا کر اسے ملایا اور کہا ہم تو اسی کو زقوم کہتے ہیں۔ اور اگر اباء واستکبار مراد لیا جائے تو وہ اس لحاظ سے فتنہ ہیں کہ اس کو اختیار کر کے لوگ دکھوں اور تکلیفوں میں پڑتے ہیں۔

1850 - ﴿كَرَّمْتَ﴾ ۔ كَرَّمَ کے لیے [دیکھو نمبر: 647]۔ اور اِكْرَامٌ اور تَكْرِيْمٌ ایسا نفع پہنچانا ہے جس میں کوئی خواری یا نقصان نہ ہو۔ (غ) ﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ﴾ [الأنبيآء: 26:21] ''بلکہ وہ معزز بندے ہیں۔'' ﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۴﴾﴾ [الذاريات: 24:51] ''کیا تیرے پاس ابراہیم کے معزز مہمانوں کی خبر آئی؟''

اَحْتَنِكَنَّ ۔ حَنَكٌ انسان اور جانور کے منہ میں اس حصہ کو جو ٹھوڑی کے نیچے اندر کی طرف ہے کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک تالو کو بھی اور اِحْتِنَاكٌ جس سے یہاں اِحْتَنِكَ فعل آیا ہے جانور کے متعلق کہا جاتا ہے جب اس کے نچلے جبڑے میں رسہ ڈال کر اسے چلایا جائے اور ٹڈی جب زمین کی روئیدگی کو کھا کر بالکل صاف کردے تو اس پر بھی اِحْتَنَكَ بولا جاتا ہے۔ پس اِحْتَنِكَ کے معنی ہوں گے انہیں قابو میں کر کے ان کا استیصال کردوں گا۔ (ل)

پچھلے رکوع میں اعدائے حق اور ان کے عذاب کا ذکر تھا۔ اب بتایا ہے کہ جو لوگ آنحضرت ﷺ کے پیغام کو پھیلانے سے روکتے ہیں وہ عذاب سے بچ نہیں سکتے۔ لیکن اس سے پہلے اپنا ایک عام قانون بیان فرمایا ہے کہ شیطان ہمیشہ سے ہی انسان کا دشمن چلا آیا ہے اور وہ راستی اور نیکی کے پھیلانے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ مگر یہاں فرمانبرداری کے انکار کے بعد شیطان کی تعلّیوں کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ اپنے بڑے بڑے دعووں میں کہ مَیں یوں کردوں گا جھوٹا ہے۔ اور اپنے اولیاء سے جو وعدے وہ کرتا ہے وہ بھی سب دھوکہ۔ ان تعلّیوں میں اعدائے حق کی تعلّیوں بلکہ تمام بدی کی طرف بلانے والوں کی تعلیوں کا نقشہ کھینچا ہے۔ مٹی سے پیدا شدہ پر فخر کرنے کی وجہ کے لیے [دیکھو نمبر: 1054]۔

1851 - مَوْفُوْرَ ۔ وَفَرَتْ کے معنی ہیں ایک چیز کو تمام اور کامل کیا۔ اسی سے موفور بمعنی کامل ہے۔ (غ)

وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَ رَجِلِكَ وَ شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۶۴﴾

اور ان میں سے جس کو تو کر سکے اپنی آواز سے خفیف کر دے اور ان پر اپنے سواروں اور اپنے پیادوں کو اکٹھا کر لا اور ان کے مالوں اور اولاد میں شریک ہو تا رہ اور ان سے وعدہ کرتا رہ اور شیطان جو ان سے وعدہ کرتا ہے سو دھوکا ہے۔ (1852)

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ

میرے بندوں پر تیرا کوئی غلبہ نہیں

1852 - اِسْتَفْزِزْ۔ فَزّ کے معنی ہیں گھبراہٹ میں ڈال دیا اور اِستَفَزَّ کے بھی یہی معنی ہیں اور نکال دیا یا اسے ہلاکت میں ڈال دیا یا ڈرا دیا یا خفیف بنا دیا۔ ﴿وَ اِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ﴾ [76] ﴿اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾ [103]

صَوْتِ۔ صَوْتٌ مطلق آواز کو کہتے ہیں خواہ اس کے معنی ہوں یا نہ ہوں۔ اور ہر آواز کو جو دو جسموں کے کھٹکھٹانے سے پیدا ہو صوت کہا جاتا ہے۔ اور اِنْصَاتٌ کے معنی ہیں باتوں کو ترک کر کے ایک کلام کو سننا ﴿وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا﴾ [الأعراف: 204:7] ''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو سنو اور چپ رہو'' (غ) اور یہاں شیطان کے وسوسہ کو یا اس کے بلانے یا اس کی تحریک کو تحقیر کے رنگ میں صوت سے تعبیر کیا ہے۔ گویا کہ وہ ایک بے معنی بات ہے۔ (د)

اَجْلِبْ۔ جَلَبٌ ایک جگہ سے ہانک کر دوسری جگہ لے جانا اور [اَجْلَبْتُ عَلَيْهِ] کے معنی ہیں اس پر زور سے چیخ ماری۔ (غ) اور [اَجْلَبَ عَلَيْهِ] کے معنی یہ بھی آتے ہیں کہ اس پر جماعتوں کو اکٹھا کر کے لایا اور اسے شر سے ڈرایا۔ (ل)

﴿بِخَيْلِكَ وَ رَجِلِكَ﴾ خَيْلٌ سوار، [دیکھو نمبر: 385] رَجِلٌ پیادہ بمعنی رَاجِلٌ، [دیکھو نمبر: 308] اور یہاں رَاجِلٌ کی جمع کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ شیطان کے سواروں اور پیادوں سے مراد بعض نے وہ سوار اور پیادے لیے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی معصیت میں جنگ کرتے ہیں اور بعض کے نزدیک مراد صرف اس کے اعوان اور اتباع ہیں یعنی اس کے مددگار۔

﴿شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ﴾ شیطان کی مالوں اور اولاد میں شرکت سے مراد بعض کے نزدیک ان کا اللہ تعالیٰ کی معصیت میں صرف کرنا اور ناجائز طریق پر کمانا ہے اور بعض نے اولاد میں شیطان کی شرکت سے مراد زنا لی ہے۔ اور بعض نے ان کا ادیان باطلہ میں داخل کرنا مراد لیا ہے۔ (ج) اور درحقیقت یہ لفظ ان سب باتوں پر حاوی ہے۔

یہاں بتایا ہے کہ شیطان جس رستہ سے بھی چاہے انسان کو بہکائے اور اپنی جمعیت سے اور اپنے اعوان و انصار سے ڈرائے یہ سب دھوکہ ہے۔ فی الحقیقت وہ انسان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔

وَ كَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ﴿٦٥﴾

اور تیرا رب کافی کارساز ہے۔ (1853)

رَبُّكُمُ الَّذِیْ یُزْجِیْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِی الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا ﴿٦٦﴾

تمہارا رب وہ ہے جو تمہارے لیے دریا میں کشتیاں چلاتا ہے تاکہ تم اس کے فضل کو طلب کرو وہ تم پر رحم کرنے والا ہے۔ (1854)

وَ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِیَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴿٦٧﴾

اور جب تمہیں دریا میں مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کھوئے جاتے ہیں جنہیں تم پکارتے ہو سوائے اس کے پھر جب وہ تمہیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تم منہ پھیر لیتے ہو اور انسان ناشکر گزار ہے۔

اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ یُرْسِلَ عَلَیْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِیْلًا ﴿٦٨﴾

تو کیا تم (اس سے) نڈر ہو کر کہ وہ تم کو خشکی کے قطعہ پر ہی نابود کر دے یا تم پر کنکر برسانے والی آندھی بھیج دے۔ پھر تم اپنے لیے کوئی کارساز نہ پاؤ۔ (1855)

1853 - اوپر کی سب باتوں کا جواب ایک ہی دیا گیا ہے کہ میرے بندوں پر شیطان کو کوئی تسلط یا غلبہ حاصل نہیں۔ عِبَادِیْ سے مراد سب بندے بھی ہو سکتے ہیں اور ﴿عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِیْنَ ۝﴾ بھی۔ اور یہ سچ ہے کہ شیطان کو فی الواقع کسی انسان پر بھی غلبہ نہیں دیا گیا یعنی وہ اسے زبردستی پکڑ کر معصیت نہیں کرا سکتا۔ جیسا کہ دوسری جگہ شیطان کا اپنا اعتراف موجود ہے ﴿اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَ وَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَ مَا كَانَ لِیَ عَلَیْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ﴾ [إبراهيم: 22:14] یعنی اللہ وعدہ دیتا تھا تو وہ وعدہ سچا ہوتا تھا اور میرا وعدہ جھوٹا نکلتا تھا اور مجھے تم پر کوئی غلبہ بھی حاصل نہ تھا (اور یہاں مخاطب خود اس کے پیچھے لگنے والے ہیں) میں صرف تمہیں بلاتا تھا تو تم فوراً میری بات مان لیتے تھے۔ البتہ جو اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے ہیں ان کو وہ بلا بھی نہیں سکتا اور ان کی مخالفت کے رنگ میں اس کی کوشش آخر کار ناکام ہوتی ہے۔

1854 - یہاں خطاب ان مشرکین سے ہے جو شیطان کے پیچھے لگ کر خدا کو چھوڑتے تھے اور شرک کرتے تھے۔ تو اپنی نعمتوں کو یاد دلایا ہے کہ ان سامانوں کا پیدا کرنے والا جن سے تم فائدہ اٹھاتے ہو اللہ تعالیٰ ہی ہے نہ تمہارے معبودان باطل۔ پھر بھی خدا کو چھوڑ کر ان کی طرف جھکتے ہو۔

1855 - حَاصِبٌ۔ حَصَبَةٌ کنکری کو کہتے ہیں اور [حَاصِبٌ] اس ہوا کو کہتے ہیں جو بوجہ اپنی شدت کے مٹی اور کنکر اڑا دیتی ہے اور

اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا ﴿۶۹﴾

یا تم (اس سے) نڈر ہو کر ایک دفعہ پھر تم کو اسی (دریا) میں لے جائے پھر تم پر کشتی توڑ دینے والی ہوا چلائے اور تم کو غرق کر دے اس لیے کہ تم نے ناشکری کی پھر تم اپنے لیے ہمارے خلاف اس کی کوئی پیروی کرنے والا نہ پاؤ۔ (1856)

وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ

اور یقیناً ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور ہم نے ان کو خشکی اور تری میں سواری دی اور ان کو اچھی چیزوں سے رزق

اس بادل کو بھی جس سے اولے برستے ہیں اور عذاب کے معنی میں بھی آتا ہے۔ جیسے حضرت علی علیہ السلام نے خوارج کو فرمایا [اَصَابَكُمْ حَاصِبٌ] یعنی تم پر عذاب آیا۔ (ل)

خسف اور ہوا کا عذاب:

یہ نقشہ قرآن کریم نے بار بار کھینچا ہے کہ کس طرح مشرک جب اس انتہائی بے کسی کی حالت کو پہنچتے ہیں جو طوفان کے وقت سمندر میں پیش آتی ہے تو شریکوں کو چھوڑ کر خدا کو پکارتے ہیں، لیکن مصائب سے نکل کر پھر اللہ تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں۔ تو فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو خشکی میں بھی یعنی اس جگہ جسے تم مقام امن سمجھتے ہو تمہیں نابود یا ذلیل کر سکتا ہے جیسا بدر میں ہوا۔ خَسِفَ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 1742]۔ یا سخت ہوا چلا کر تمہاری قوت کو توڑ سکتا ہے جیسا کہ غزوہ احزاب میں ہوا۔

1856 - قَاصِفٌ وہ ہوا ہے جو جس چیز پر چلے درخت ہو یا عمارت اسے توڑ دے اور خطرناک گرج کو [رَعْدٌ قَاصِفٌ] کہتے ہیں۔ (غ)

تَبِيْعَ۔ تَبِعَ کے معنی ہیں پیروی کی اور تَبِيْعَ کئی معنی میں آتا ہے۔ حدیث زکوٰۃ میں اس سے مراد گائے کا نر بچہ ہے جب ایک سال کا ہو جائے۔ اس لیے کہ وہ ماں کے پیچھے چلتا ہے اور حدیث حدیبیہ میں تَبِيْعٌ بمعنی خادم ہے اور تَبِيْعَ وہ بھی ہے جو کسی حق کے لیے جس کا وہ مطالبہ کرتا ہے دوسرے کا پیچھا کرے (یعنی ناصر یا بدلہ لینے والا) اور یہاں یہی معنی ہیں اور بعض نے تَبِيْعَ کے معنی یہاں کیے ہیں ایسا پیچھا کرنے والا جو اس عذاب کا جو تم پر نازل ہوا انکار کرے یا اسے تم سے پھیر سکے (ل) شاید کشتیوں پر فخر کرنے والی قوم کو سمجھایا ہے کہ ایک دفعہ کشتی بچ نکلے تو دوسری دفعہ غرق ہو سکتی ہے اور یا عمومیت ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر ایک وقت شدائد و مصائب سے جن کو ظلمات بحر سے تشبیہ دی جاتی ہے نجات دے دے۔ تو انسان کو نڈر نہ ہونا چاہیے اور یہاں خطاب اس قوم کو کیا ہے جو مخالفت حق پر کمر بستہ ہو رہی ہے۔

فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴿٧٠﴾

دیا اور ہم نے ان کو بہتوں پر جنہیں ہم نے پیدا کیا ہے بڑی فضیلت دی ہے۔ (1857)

يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۢ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿٧١﴾

جس دن ہم سب لوگوں کو ان کے سرداروں کے ساتھ بلائیں گے تو جسے اس کی کتاب اس کے داہنے ہاتھ میں دی جائے گی وہ اپنی کتاب کو پڑھیں گے اور ان پر ذرہ بھر ظلم نہ ہوگا۔ (1858)

1857 - یہاں سب بنی آدم کو عزت اور بزرگی دینے کا ذکر ہے۔ اور یہ بحیثیت مخلوق کے بمقابلہ دوسری مخلوق کے ہے اور کثیر سے مراد یہ نہیں کہ بہت سی قسم کی مخلوق پر تو بنی آدم کو فضیلت دی ہے اور بعض پر نہیں بھی دی۔ یعنی کثیر کسی کے مقابلہ پر نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ تمہیں ایک دو قسم کی مخلوق پر فضیلت نہیں دی بلکہ بہت قسموں کی مخلوق پر فضیلت دی ہے۔ کیونکہ دوسری جگہ صاف فرمایا ﴿وَّ هُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ [الأعراف: 140:7] ''اور اس نے تم کو مخلوقات پر فضیلت دی ہے۔'' اور علاوہ ازیں یہاں اس تکریم کا ذکر بمقابلہ شیطان کے انکار تکریم سے ہے ﴿هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ﴾ کیونکہ انسان کی فرمانبرداری کا اسے حکم تھا اور انسان کی فرمانبرداری کا ملائکہ کو بھی حکم تھا۔ پس جس دلیل سے انسان کی مکرمت شیطان پر ثابت ہے اسی دلیل سے ملائکہ پر بھی اس کا شرف ثابت ہے اور یہ شرف اس لحاظ سے ہے کہ اس کی ترقیات غیر متناہیہ ہیں اور یہاں بنی آدم کی بزرگی کے ذکر میں یہ اشارہ ہے کہ ہم نے تو تم کو سب مخلوق پر فضیلت دی ہے تم کیوں اس کمال نفس کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اپنی کرتوتوں سے اسے ذلیل کرتے ہو۔

1858 - یَمِیْنٌ کے مختلف معانی کے لیے [دیکھو نمبر: 605]۔ قرآن کریم میں اس لفظ کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لیے جہاں ہوا ہے وہ بطور استعارہ اور مجاز ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تشبیہ اور جسم سے پاک ہے۔ (ل) اور حدیث میں آتا ہے [وَكِلْتَا يَدَيْهِ يَمِيْنٌ] (صحيح مسلم، كتاب الامارة، باب فَضِيلَةِ الإِمَامِ الْعَادِلِ وَعُقُوبَةِ الْجَائِرِ وَالْحَثِّ عَلَى الرِّفْقِ بِالرَّعِيَّةِ وَالنَّهْيِ عَنْ إِدْخَالِ الْمَشَقَّةِ عَلَيْهِمْ، حديث: 4825) اس کے دونوں ہاتھ یمین ہیں۔ یعنی صفت کمال سے متصف ہیں اور ایک سے دوسرے میں کچھ کمی نہیں۔ کیونکہ بایاں ہاتھ بہ نسبت دائیں کے ناقص ہوتا ہے۔ (ل) اور انسان کے متعلق بھی اس کا استعمال سوائے دائیں ہاتھ کے اور معنی میں ہوتا ہے۔ [هُوَ عِنْدَنَا بِالْيَمِيْنِ] کے معنی ہیں وہ ہمارے ہاں بمنزلہ حسنہ یا اچھا مقام رکھتا ہے اور ﴿اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ﴾ [الصافات: 28:37] ''تم بڑے زور سے ہمارے پاس آتے تھے۔'' میں زجاج نے معنی کیے ہیں [بِاَقْوَى الْاَسْبَابِ] یعنی نہایت قوی ذرائع کے ساتھ اور ایسا ہی ﴿فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا

وَ مَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِی اور جو کوئی اس (دنیا) میں اندھا رہا تو وہ آخرت میں

بِالْیَمِیْنِ ﴿۹۳﴾[الصافات: 93:37] ''پھر انہیں زور سے مارنے کی طرف متوجہ ہوا'' میں ایک معنی قوت لیے گئے ہیں۔(ل) یُظْلَمُوْنَ۔ظُلْمٌ کے لیے[دیکھو نمبر: 55] حق سے مجاوزت کمی سے ہو یا زیادتی سے ظلم ہے۔اور اس لیے اس کے معنی صرف کم کرنے کے بھی آتے ہیں جیسے ﴿وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾[البقرۃ: 57:2] ''اور انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہ کیا، بلکہ اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچاتے تھے۔'' یعنی ہمارا کچھ کم نہیں کیا ﴿كِلْتَا الْجَنَّتَیْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَ لَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَیْـًٔا﴾[الکھف: 33:18] ''یہ دونوں باغ اپنے پھل دیتے تھے اور اس میں کوئی کمی نہ کرتے تھے۔'' یعنی اس میں سے کچھ کم نہیں کیا۔(ل) یہی معنی یہاں ہیں یعنی ان کے اعمال حسنہ میں کوئی کمی نہ کی جائے گی۔

پچھلے رکوع میں مخالفین کو سمجھایا تھا کہ عذاب الٰہی سے نڈر نہ ہوں۔اس میں مخالفین کی ان کوششوں کا ذکر کیا ہے جو وہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف کر رہے تھے۔اور پہلی دو آیتوں میں پچھلے رکوع کی آخری آیت کے سلسلہ میں کہ بنی آدم کو ہم نے کتنا بڑا شرف عطا فرمایا ہے یہ بتایا ہے کہ جو کوئی اس کمال کے حاصل کرنے سے محروم رہتا ہے اسی لیے محروم رہتا ہے کہ اس کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر رکھتا ہے۔امام سے مراد یہاں روحانی سردار یعنی انبیاء ہی ہیں جن کی پیروی کا لوگ دعویٰ کرتے تھے۔اس لیے دوسری جگہ انہیں شہید کہا ہے ﴿فَكَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِیْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِیْدًا﴾[النسآء: 41:4] ''پھر کیا حال ہوگا جب ہم ہر ایک امت سے گواہ لائیں گے اور تجھ کو ہم ان پر گواہ لائیں گے۔'' اور امام کے ساتھ بلانے سے مراد یہ ہے کہ ان کے امام نے تو انہیں کمال انسانی کی طرف دعوت دی تھی پھر ایک گروہ نے اس کی پیروی کی اور اس کمال کو پالیا اور دوسرے نے اس سے آنکھیں بند کر لیں اور محروم رہ گئے۔اور بعض نے امام سے مراد ان کے اعمال اور بعض نے وہ کتاب مراد لی ہے جو ان پر نازل کی گئی۔(ج) اور نبی یا کتاب کا معنی کے لحاظ سے مفہوم ایک ہی ہے۔امام کے لیے[دیکھو نمبر: 155]۔

کتاب کے دائیں ہاتھ میں دیا جانے سے کیا مراد ہے:

قرآن کریم میں جہاں بعض لوگوں کے یمین میں کتاب دینے کا ذکر ہے تو دوسروں کے لیے مختلف پیرائے اختیار کیے ہیں۔کہیں تو اس کے مقابل پر فرمایا ﴿وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ﴾[الحاقۃ: 25:69] ''اور جس کی کتاب اس کے بائیں (ہاتھ) میں دی جائے گی۔'' اور کہیں فرمایا ﴿وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ﴿۱۰﴾﴾[الانشقاق: 10:84] ''اور جس کی کتاب اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دی گئی۔'' اور یہاں کتاب کو یمین میں دینے کے مقابل پر فرمایا ﴿وَ مَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى﴾ تو پس یمین میں کتاب ہونے کے مقابل پر شمال میں کتاب ہونا بھی ہے۔اور پیٹھ پیچھے کتاب ہونا بھی اور اندھا ہونا بھی۔اس سے معلوم ہوا کہ یہ قیامت کے دن کتابوں کا دیا جانا ﴿جَزَآءً وِّفَاقًا﴾[النبأ: 26:78] ''بدلہ موافق (اعمال ہے)۔'' کے رنگ میں ہے۔یعنی ایک لوگ وہ ہیں جو اس کتاب کو جو انہیں ان کے نبی کی معرفت ملتی ہے اس دنیا میں یمین میں لیتے ہیں یعنی قوت وقدرت سے اس پر عمل کرتے ہیں اور ایک وہ ہیں جو شمال میں لیتے ہیں یعنی ناقص طور پر

الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۷۲﴾ بھی اندھا ہوگا اور راہ سے بہت دور پڑا ہوا۔ (1859)

اسے لیتے ہیں یا ﴿وَرَآءَ ظَهْرِهٖ﴾ یعنی اسے پیٹھ پیچھے پھینک دیتے ہیں۔ جیسا دوسری جگہ ہے ﴿فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ﴾ [آل عمران: 187:3] ''پھر انہوں نے اس کو اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا۔'' یا وہ جو بالکل ہی اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور اندھے رہتے ہیں۔ تو اسی کے مطابق قیامت میں ان سے معاملہ ہوگا۔ جس نے یہاں کتاب کو یمین میں لیا اسے وہاں بھی یمین میں دی جائے گی اور جس نے یہاں شمال میں لیا اسے وہاں بھی شمال میں ملے گی اور جس نے یہاں کتاب کو پیٹھ پیچھے پھینکا اس کو وہاں بھی پیٹھ پیچھے ملے گی۔ اور جو یہاں اندھا رہا وہ وہاں بھی اندھا ہوگا۔ رہا یہ کہ یمین یا شمال یا ﴿وَرَآءَ ظَهْرِهٖ﴾ دینا کس رنگ میں ہوگا۔ سو ان کیفیات کو ہم اس دنیا میں نہیں سمجھ سکتے۔ آخرت کے جتنے معاملات ہیں [مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ] (صحيح البخاری، كتاب بدء الخلق، باب مَا جَاءَ فِي صِفَةِ الْجَنَّةِ وَأَنَّهَا مَخْلُوقَةٌ، حديث: 3244) کے مصداق ہیں۔ دوزخی اندھے بھی ہوں گے اور دیکھیں گے بھی ان کو کلام کی اجازت بھی نہیں ہوگی اور بولیں گے بھی وہ جنت سے دور بھی ہوں گے اور جنتیوں سے پانی وغیرہ بھی مانگیں گے۔ اور انہی یمین میں کتابوں والوں کو جو ﴿اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ﴾ اور شمال میں کتابوں والوں کو ﴿اَصْحٰبُ الشِّمَالِ﴾ کہا ہے تو ﴿اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ﴾ کے معنی امام راغب کرتے ہیں [أَصْحَابُ السَّعَادَاتِ وَالْمَيَامِنِ] یعنی سعادتوں اور برکتوں والے اور ایک حدیث میں جو ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کی ہے یوں آتا ہے کہ کتاب یمین ملتے ہی اس شخص کا چہرہ روشن ہو جائے گا۔

نامۂ اعمال کا پڑھنا:

﴿فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ﴾ سے کیا مراد ہے؟ بظاہر ﴿يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ﴾ کے مقابلہ پر اگلی آیت اَعْمٰی لانے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے نہیں پڑھیں گے۔ مگر اس سورت میں گزر چکا کہ سب کو حکم ہوگا ﴿اِقْرَاْ كِتٰبَكَ﴾ [14] اپنی اپنی کتابیں پڑھو۔ [دیکھو نمبر: 1813]

پس یہ پڑھنا ایسا ہی ہے جیسے اندھا بھی پڑھ سکتا ہے اور چونکہ پڑھنے سے انسان کو علم حاصل ہو جاتا ہے اس لیے اصل منشا یہی ہے کہ انہیں ان اچھے اور برے اعمال کا علم ہو جائے گا مگر نہ صرف واقعات کے رنگ میں بلکہ نتائج کے رنگ میں۔ کیونکہ بار بار اس کا ذکر یوں بھی آتا ہے ﴿ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ [العنكبوت: 55:29] ''چکھو جو تم عمل کرتے تھے۔'' اور چکھنے سے مراد نتائج کا بھگتنا ہوتا ہے۔

1859 - **آخرت میں اندھا ہونا:** اَعْمٰی کے لیے [دیکھو نمبر: 1457]۔ پہلے اَعْمٰی سے مراد مجازاً اندھا لیا گیا ہے اور دوسرے سے حقیقی طور پر اندھا۔ لیکن دوسری جگہ فرمایا ﴿فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿۲۲﴾﴾ [ق: 22:50] یعنی اس دن نظر تیز ہو جائے گی اور دوسری آیات سے بھی ان کا دیکھنا ثابت ہے۔ پس دوسرے اَعْمٰی سے مراد بھی ایسا اندھا نہیں ہو سکتا کہ جس کی بصارت نہ ہو اور ﴿اَضَلُّ سَبِيْلًا﴾ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور اضل اسے اس لیے کہا کہ جو شخص غلط راستہ کو اختیار کر لیتا ہے

وَ اِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَ اِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ﴿۷۳﴾

اور وہ تجھے اس سے ہٹانے ہی لگے تھے جو ہم نے تیری طرف وحی کی تا کہ تو اس کے سوائے ہم پر جھوٹ بنالے اور تب یہ تجھے ضرور دوست بنالیتے۔ (1860)

وَ لَوْ لَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ﴿۷۴﴾

اور اگر ہم نے تجھے ثابت قدم نہ بنایا ہوتا تو تُو تھوڑا سا ضرور ان کی طرف جھک جاتا۔ (1861)

اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾

تب البتہ ہم تجھے دگنا (عذاب) زندگی میں اور دگنا مرنے پر چکھاتے پھر تو ہمارے خلاف کوئی مددگار نہ پاتا۔ (1862)

وہ روز بروز حق سے دور ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس آیت میں دوزخ کی کیفیات کو دوسرے رنگ میں بیان کیا ہے اور عذاب نار کے پہلو بہ پہلو یہ نقشہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ اور اعمٰی سے مراد یہاں یہی ہوسکتی ہے کہ اپنے رب کے لقاء سے محروم رہے گا اور وہ نور اسے نہ ملے گا جو مومنوں کو ملے گا بلکہ وہ تاریکیوں میں رہے گا۔

1860 - ﴿لَيَفْتِنُوْنَكَ﴾ - يَفْتِنُوْنَ. فَتَنٌ سے ہے اس کے ایک معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 376]۔ اور راغب نے یوں معنی کیے ہیں کہ تجھے بلا اور مصیبت میں ڈال دیں۔ (غ)

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے بعض مدنی واقعات کا ذکر کر دیا ہے۔ حالانکہ سورت اور اس کی یہ آیت مکی ہے اور اس میں اشارہ قریش کے اس وفد کی طرف ہے جس کا ذکر ابن ہشام میں ہے۔ یعنی جب آپ کو اور آپ کے صحابہ کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچا کر قریش آپ کے دعوت الی الاسلام کے کام کو روکنے میں ناکامیاب ہوئے تو انہوں نے لالچ دے کر آپ کو اس کام سے روکنا چاہا اور آپ کی خدمت میں ایک وفد پہنچا کہ قرآن شریف میں آپ ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ معبودان کا ذکر چھوڑ دیں تو جو چیز آپ چاہیں دولت، حسن، حکومت وہ سب حاضر کرنے کو تیار ہیں، مگر آپ نے اس لالچ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔

1861 - اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ ارادہ کیا تھا کہ قریش کی بات مان لیں اور نہ الفاظ سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے۔ بلکہ یہاں تو صاف فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ثابت قدم نہ کیا ہوتا تو جھک جاتا یعنی لالچ اس قدر زبردست تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی خاص حفاظت آپ کے شامل حال نہ ہوتی تو آپ جھک جاتے یا کوئی آدمی کتنا بھی بڑا ہوتا جھک جاتا۔ اگلی آیت بھی یہی بتاتی ہے کہ آپ نے کبھی ایسا ارادہ نہیں کیا کیونکہ عذاب نہیں آیا۔

1862 - ﴿ضِعْفَ الْحَيٰوةِ﴾ سے مراد دو چند عذاب دنیا ہے اور ﴿ضِعْفَ الْمَمَاتِ﴾ سے مراد دو چند عذاب آخرت۔ اور قتادہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا پڑھی [اَللّٰهُمَّ رَحْمَتَكَ اَرْجُو. فَلَا تَكِلْنِي اِلٰى

وَ اِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَ اِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۷۶﴾

اور وہ تجھے اس سرزمین میں خفیف بنانے لگے تھے تاکہ تجھے اس سے نکال دیں اور اس صورت میں یہ بھی تیرے پیچھے نہ ٹھہرتے مگر تھوڑی مدت۔ (1863)

سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَ لَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ﴿۷۷﴾ ع 8 7 8

یہی (ہمارا) طریق ان رسولوں سے رہا جنہیں ہم نے تجھ سے پہلے بھیجا اور تو ہمارے طریق میں کوئی تبدیلی نہیں پائے گا۔ (1864)

نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ.] (سنن أبی داؤد، کتاب الادب، باب مَا يَقُولُ إِذَا أَصْبَحَ، حدیث: 5092) اے اللہ مجھے اپنے نفس کے سپرد ایک لمحہ کے لیے بھی نہ کیجیو۔ جس سے معلوم ہوا کہ آپ کس قدر حفاظت الٰہی پر بھروسہ رکھتے تھے۔

1863 - اس آیت میں قریش کے اس ارادہ کا ذکر ہے کہ آپ کو ہلکا اور خفیف بنا کر نکال دیں اور یہ قریش کی آخری تدبیر کی طرف اشارہ نہیں جو دارالندوہ میں ہوئی تھی، جس کا ذکر دوسری جگہ ان الفاظ میں ہے ﴿وَ اِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ﴾ [الأنفال: 30:8] ''اور جب وہ جو کافر ہوئے تیرے متعلق تدبیریں کرتے تھے تاکہ تجھے قید کریں یا تجھے قتل کریں یا تجھے نکال دیں۔'' یہاں صرف استفزاز کا ذکر ہے اور یہ اشارہ آپ کے شعب ابی طالب میں قید کر دینے کی طرف ہے۔ اور اصل غرض یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ گھبرا کر اس سرزمین کو چھوڑ دیں۔ اور چونکہ آخر نبی کریم ﷺ کو ہجرت کرنی پڑی تو اس لحاظ سے فرمایا کہ گو یہ اس میں کامیاب تو نہ ہوئے لیکن جب تم حکم الٰہی کے ماتحت مکہ سے نکل جاؤ گے تو پھر یہ بھی تمہارے بعد تھوڑے ہی دن یہاں ٹھہریں گے۔ چنانچہ یہ پیشگوئی پوری ہوئی اور آپ کی ہجرت کے ڈیڑھ سال بعد ہی قریش کو بدر میں ایسی سخت شکست اٹھانی پڑی کہ ان کی قوت ٹوٹ گئی اور آخر آٹھ ہی سال میں فتح مکہ اور ان کا دورِ حکومت و تکلیف دہی ختم ہو گیا۔ اور یہ جو بعض مفسرین نے یہاں یہود کے مطالبہ کا کہ انبیاء علیہم السلام کی سرزمین شام ہے آپ وہاں جائیں اور اس کے ساتھ آپ کے تبوک جانے کا ذکر کیا ہے تو واقعات تاریخی کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ کیونکہ یہ سورت مکی ہے اور تبوک کا غزوہ آخری ایام مدینہ کا ہے۔

1864 - یعنی جب رسولوں کی تکالیف اس انتہا کو پہنچ جاتی ہیں کہ انہیں وہ سرزمین چھوڑنی پڑتی ہے تو پھر مخالفین خود بھی جلد ہی ہلاک ہو جاتے ہیں۔ یہی سنت اللہ در بارہ رسل ہے جس کا یہاں ذکر کیا ہے۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝۷۸	سورج کے ڈھلنے سے (شروع کر کے) رات کے اندھیرے تک نماز کو قائم رکھ اور صبح کے قرآن کو (بھی) صبح کے قرآن میں حضور ہوتا ہے۔ (1865)

1865 - دُلُوْكِ ۔ دَلَكَ کے معنی ملنا ہیں جیسے جسم کو نہاتے وقت یا کپڑے کو دھوتے وقت۔ (ل) اور حدیث میں [دُلُوكُ الشَّمْسِ] (مؤطا امام مالك، كتاب وقوت الصلاة، باب مَا جَاءَ فِي دُلُوكِ الشَّمْسِ وَغَسَقِ اللَّيْلِ، حديث:19) کئی جگہ پر آیا ہے۔ اور اس سے مراد دوپہر کے بعد اس کا ڈھلنا بھی ہے اور اس کا غروب بھی اور اصل معنی دُلُوْكِ کے مائل ہونا ہیں۔ (ن) کلام عرب میں دُلُوْكِ کے معنی زوال ہی تھے، اس لیے سورج کو جب دوپہر کے بعد ڈھلے دَالِكَةٌ کہا جاتا تھا اور غروب ہونے کی حالت پر بھی یہی لفظ بولا جاتا تھا۔ کیونکہ دونوں حالتوں میں اس کا زوال ہے۔ (ل) راغب نے اس کے معنی کیے ہیں [مَيْلُهَا لِلْغُرُوْبِ] اس کا مائل ہونا غروب کے لیے۔ (غ) اور یہی معنی زجاج نے کیے ہیں اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن عمر رضی اللہ عنہما اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے یہی معنی مروی ہیں۔ گویا دُلُوْكِ کی ابتدا ڈھلنے سے ہے اور اس کی انتہا غروب ہونا ہے۔ اس لیے دونوں حالتوں پر بولا گیا ہے۔

غَسَقِ ۔ غَسَقَ رات کی شدت تاریکی کو کہتے ہیں اور غَاسِقٌ تاریک رات کو کہتے ہیں اور ﴿مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ﴾ [الفلق: 3:113] ''تاریک رات کے شر سے۔'' میں مراد اس سے رات کو آنے والی مصیبت لی گئی ہے۔

نماز فجر کے مشہود ہونے سے مراد:

مَشْهُوْد۔ یعنی ایسا کرنے والے کے پاس شفا اور رحمت اور توفیق اور سکینت وغیرہ جن کا ذکر ﴿نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [82] میں ہے آموجود ہوتی ہے۔ (غ) کیونکہ شَهِدَ کے معنی ہیں موجود ہوا یا گواہ ہوا اور ایک حدیث میں ہے کہ رات اور دن کے ملائکہ اس وقت حاضر ہوتے ہیں۔ (ر) اور سکینت اور توفیق اور شفا اور رحمت بھی ملائکہ کے ذریعہ سے ہی انسان کو ملتے ہیں اور رات چونکہ سکون کے لیے ہے اور دن جدوجہد اور سعی کے لیے۔ اس لیے بھی رات اور دن کے ملائکہ کے جمع ہونے سے مراد یہ ہوسکتی ہے کہ اس وقت انسان کو پورا حضور قلب میسر ہوتا ہے۔

پچھلے رکوع میں جب کفار کے فتنوں اور مخالفت کی کوششوں کا ذکر کر کے ہجرت نبوی کا ذکر بطور پیشگوئی کیا تو اسی مضمون کو جاری رکھتے ہوئے مصائب میں قیام صلوٰۃ پر مداومت کی طرف توجہ دلائی جیسا کہ ﴿اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ﴾ [البقرة: 153:2] ''صبر اور نماز کے ساتھ مدد مانگو۔'' کا منشا ہے۔ جس قدر مصائب بڑھیں اسی قدر زیادہ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکنے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہاں ان مصائب کی طرف اور مصائب سے نکلنے کی طرف ﴿لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ﴾ اور ﴿غَسَقِ الَّيْلِ﴾ اور ﴿قُرْاٰنَ الْفَجْرِ﴾ میں صاف اشارہ بھی ہے۔ گویا زوال آفتاب مصیبت کی ابتدا ہے (اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا آفتاب اقبال تو

وَ مِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾

اور رات کے کچھ حصے میں اس (قرآن) کے ساتھ جاگتا رہ یہ تیرے لیے نفل کے طور پر ہے۔ امید ہے کہ تیرا رب تجھے بڑی تعریف کے مقام پر کھڑا کرے۔ (1866)

واقعی نصف النہار کے آفتاب کی طرح روشن تھا جب آپ نے دعویٰ کیا کیونکہ سب لوگ آپ کی امانت، صداقت، راستبازی کے قائل تھے) اور اس کے مقابل پر نماز ظہر ہے۔ پھر آفتاب جوں جوں ڈھلتا ہے وہ مصیبت کی زیادتی ہے یہاں تک کہ عصر کے ساتھ اس کی دھوپ پھیکی پڑ جاتی ہے۔ اور اس کے مقابل نماز عصر ہے اور آخر وہ غروب ہوتا ہے اور اس کے مقابل نماز مغرب ہے اور تاریکی کا زمانہ شروع ہو کر شدت ظلمت میں انسان مبتلا ہوتا ہے۔ گویا مصیبت اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے اور اس کے مقابل نماز عشا ہے۔ لیکن اس کے بعد فجر کی روشنی بھی نمودار ہو جاتی ہے۔ اسی لیے ﴿قُرْاٰنَ الْفَجْرِ﴾ کو باقی نمازوں سے الگ کر کے بیان کیا ہے۔ گویا یوں فرمایا کہ اگر مصائب بڑھتے بڑھتے تمام طرف تاریکی ہی تاریکی پھیل جائے تو بھی اللہ تعالیٰ اپنی طرف رجوع کرنے والے بندوں کو ضائع نہیں کرتا بلکہ مصائب کی تاریکی کو دور کر کے روشنی نمودار کرتا ہے۔

پانچ نمازیں:

یہاں پہلی نماز نماز ظہر کو قرار دیا ہے اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے جب آنحضرت ﷺ کو نماز سکھائی تو نماز ظہر سے ہی ابتدا کی اور ﴿لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ﴾ میں دونوں نمازیں ظہر اور عصر کی آجاتی ہیں۔ اور ﴿غَسَقِ الَّیْلِ﴾ مغرب اور عشا۔ کیونکہ رات کی تاریکی مغرب سے شروع ہو کر عشا کے وقت کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ اور پانچویں نماز فجر کا علیحدہ ذکر کیا ہے اور ﴿قُرْاٰنَ الْفَجْرِ﴾ سے مراد نماز فجر ہی ہے۔ اور اس نام میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس میں قراءت لمبی ہوتی ہے۔ اور دو دو نمازوں کے اکٹھا ذکر کرنے سے یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ بوقت ضرورت ظہر اور عصر کی اور مغرب اور عشا کی نمازیں جمع بھی کی جا سکتی ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ سے ان نمازوں کا سفر میں جمع کرنا ثابت ہے اور بغیر سفر مدینہ میں جمع کرنا بھی۔ اور بارش یا بیماری میں بھی جمع ہو سکتی ہیں اور کسی اور ضرورت کے وقت بھی۔ مگر نہ یوں کہ بلا وجہ اس کی عادت کر لی جائے۔ اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے متعلق روایت ہے کہ آپ نے ایک دن عصر کے بعد وعظ شروع کیا یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا اور ستارے نکل آئے اور لوگوں نے نماز نماز پکارنا شروع کیا اور جب ایک شخص نے بہت زور سے اس طرح چلانا شروع کیا تو آپ نے اسے ڈانٹا اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ظہر اور عصر اور مغرب اور عشا میں جمع کرتے دیکھا۔ اور جمع تاخیر بہتر ہے۔ یعنی ظہر کو پیچھے کر کے عصر کے قریب کر لینا اور مغرب میں تاخیر کر کے عشا کے قریب کر لینا اور جمع تقدیم بھی جائز ہے۔

1866 - تَهَجَّدْ۔ هَجُوْدٌ کے معنی نیند ہیں اور هَجَّدْتُّهٗ کے معنی ہیں اس کی نیند کو دور کر دیا اور اسی معنی میں تہجد ہے اور ﴿فَتَهَجَّدْ بِهٖ﴾ سے مراد ہے کہ قرآن کے ساتھ جاگتا رہ اور یہ رات کی نماز پر ترغیب ہے۔ (غ) اور تَهَجَّدَ بِهٖ میں ضمیر قرآن کی طرف ہے یعنی نماز میں تلاوت قرآن کے ساتھ جاگتا رہ اور بعض لیل کی طرف بھی ہو سکتی ہے جو من سے مفہوم ہے یعنی رات کے ایک حصہ میں تہجد

وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ﴿۸۰﴾

اور کہہ اے میرے رب مجھے سچائی کے داخلہ سے داخل کیجیو۔ اور سچائی کا نکلنا نکالیو اور مجھے اپنے پاس سے مدد دینے والی قوت دے۔ (1867)

پڑھ اور اصطلاح شریعت میں تہجد وہ نماز ہے جو رات کے وقت سو کر اٹھنے کے بعد پڑھی جائے۔ یعنی اس میں پہلے سونا لازمی ہے۔

نَافِلَةً۔ نفل وہ ہے جو واجب سے زیادہ ہو، [دیکھو نمبر: 1202]۔ اور نَافِلَةً وہ ہے جو انسان کرتا ہے اور وہ اس پر واجب نہیں اور عبادات پر آتا ہے۔ اور چونکہ بیٹے کا بیٹا اصل پر زیادت ہے اس لیے پوتے کو بھی نَافِلَةً کہتے ہیں ﴿وَ یَعْقُوْبَ نَافِلَةً﴾ [الأنبیآء: 72:21] ''اور یعقوب پوتا۔'' (ل)

پانچ فرض نمازوں کے بعد نماز تہجد کا ذکر کیا ہے جو پچھلی رات پڑھی جاتی ہے اور نفل کے طور پر ہے۔ اور یہ گیارہ یا تیرہ رکعت ہوتی ہے جو دو دو کر کے پڑھی جاتی ہیں اور آخر میں ایک۔ یا صبح ہو جانے کی صورت میں اس سے کم جس قدر ہو سکے۔ نماز تہجد کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص کہا گیا ہے۔ مگر دوسری جگہ صاف فرمایا ﴿وَ طَآىِٕفَةٌ مِّنَ الَّذِیْنَ مَعَكَ﴾ [المزمل: 20:73] ''ان میں سے بھی ایک گروہ جو تیرے ساتھ ہیں۔'' ہر ایک مسلمان کو پچھلی رات اٹھنے اور نماز تہجد کی عادت ڈالنی چاہیے اور مقام محمود سے مراد مقام شفاعت عظمیٰ ہے۔ جیسا احادیث میں وارد ہے۔ اور بخاری کی حدیث کے آخر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مقام محمود پر کھڑا کرے گا جس کی تشریح یوں کی ہے [یَحْمَدُهُ أَهْلُ الْجَمْعِ كُلُّهُمْ] (صحیح البخاری، کتاب الزکاۃ، باب مَنْ سَأَلَ النَّاسَ تَكَثُّرًا، حدیث: 1475) سب لوگ جو جمع ہوں گے آپ کی حمد کریں گے۔ اور بعض احادیث میں مقام محمود سے مراد شفاعت ہی لی گئی ہے۔ (ر)

1867 - **ہجرت میں کامیابی کی پیشگوئی:** سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیت ہجرت کے بارہ میں نازل ہوئی۔ (ج) یعنی دخول سے مراد دخول مدینہ ہے اور خروج سے مراد مکہ سے نکلنا۔ دخول کو خروج پر مقدم اس لیے کیا کہ وہ اہم ہے اور غرض یہ ہے کہ آپ کو ضائع نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ اگر آپ مکہ سے نکلیں گے تو آپ کے داخل ہونے کی جگہ اس سے پیشتر مقرر ہو چکی ہے۔ اور سیاق مضمون سے بھی صاف اشارہ ہجرت کی طرف ہی معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ پچھلے رکوع میں صفائی سے بیان ہو چکا ہے اور ﴿سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا﴾ [80] سے مراد غلبہ ہے جس سے آپ کو نصرت ملے اور بعض نے اسے فتح مکہ کہا ہے اور اس پر اگلی آیت شاہد ہے کیونکہ یہی الفاظ نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ پر پڑھے۔ اور بعض نے سلطان سے مراد بادشاہ لیا ہے۔ یعنی ہر زمانہ میں کوئی دین کا ناصر بادشاہ پیدا ہوتا رہے۔ (ر) اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں آپ کو بار بار بتا دیا تھا کہ آپ کو ہجرت کرنی پڑے گی اور اسی سے آپ کی کامیابی کی ابتدا ہوگی اور ہجرت فی الواقع تمام کامیابیوں کی جڑ ہے بشرطیکہ اپنی شرائط کے ساتھ ہو۔

وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾

اور کہہ حق آ گیا اور باطل بھاگ گیا باطل بھاگنے والا ہی تھا۔(1868)

وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَ لَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾

اور ہم قرآن سے وہ کچھ اتارتے ہیں جو مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے اور ظالموں کو یہ صرف نقصان میں بڑھاتا ہے۔(1869)

1868 - زَهَقَ۔ زَهَقَتْ نَفْسُهٗ کے معنی ہیں کسی چیز پر افسوس کرتے ہوئے اس کی جان نکل گئی ﴿وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ﴾[التوبة: 55:9] ''اور ان کی جانیں نکلیں۔'' (غ)۔۔۔ اور [زَهَقَ الشَّیْءَ] کے معنی ہیں وہ چیز باطل ہوگئی اور نابود ہوگئی ﴿فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ﴾[الأنبیآء: 18:21] ''پس ناگہاں وہ نابود ہوجاتا ہے۔'' (ل)

خانہ کعبہ سے بتوں کے دور کیا جانے اور پھر بت پرستی کے کبھی نہ آنے کی دوہری پیشگوئی: بخاری میں ہے کہ نبی کریم ﷺ جب فتح مکہ کے بعد مکہ میں داخل ہوئے تو اس وقت کعبہ میں تین سو ساٹھ بت تھے۔ آنحضرت ﷺ ایک چھڑی سے جو آپ کے ہاتھ میں تھی ایک ایک بت کو مارتے اور یہ آیت پڑھتے جاتے تھے اور اس کے ساتھ ہی یہ آیت بھی ﴿وَ مَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَ مَا يُعِيْدُ﴾[السبأ: 49:34] ''اور باطل نہ (کسی امر کی) ابتدا کرسکتا ہے اور نہ لوٹا سکتا ہے۔'' کس قدر عظیم الشان پیشگوئی اس وقت پوری ہوئی جو بے کسی کی حالت میں مکہ میں بیان کی گئی تھی اور کس قدر عظمت اس پیشگوئی کو حاصل ہے جس کا نظارہ ہم آج بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اس خانہ کعبہ میں پھر وہ بت نہیں جا سکے اور الْحَقُّ کا آنا آپ کی تشریف آوری ہی تھی۔ اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی میں آپ کو روح حق کہا گیا ہے۔

1869 - قرآن شریف روحانی بیماریوں کی شفا کے لیے نازل ہوا اور یہی شفا یہاں مراد ہے۔ جیسا کہ خود فرمایا ﴿وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾[یونس: 57:10] ''اور اس کے لیے شفا جو سینوں میں ہے۔'' اور جس طرح یہاں مومنوں کے لیے شفا اور رحمت قرار دے کر امراض روحانی سے شفا کی طرف اشارہ کیا اسی طرح دوسری جگہ ایمان والوں کے لیے اسے ہدایت اور شفا فرمایا ﴿هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّ شِفَآءٌ﴾[حٰمٓ السجدة: 44:41] ''وہ ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہدایت اور شفا ہے۔'' اور حدیث میں ہے کہ [مَنْ لَّمْ يَسْتَشْفِ بِالْقُرْآنِ فَلَا شَفَاهُ اللّٰهُ] (کنز العمال، جلد10، صفحہ9، حدیث: 28106) جو شخص قرآن سے شفا نہیں چاہتا اللہ تعالیٰ اسے شفا نہ دے اور یہاں بھی یہی شفا مراد ہے نہ کہ امراض جسمانی سے شفا۔ اور تعویذ کے طور پر قرآن شریف کی یا دوسری عبارتیں لکھ کر بیماروں کو پلانا کسی حدیث سے ثابت نہیں۔ اور حسن اور مجاہد اور نخعی نے لوگوں کو اس سے روکا۔ (ر) اور تبرک کے طور پر قرآن شریف کا کوئی حصہ لکھ کر بڑے یا چھوٹے کا اپنے پاس رکھنا ایک علیحدہ امر ہے۔ مگر قرآن شریف کو امراض جسمانی کے لیے استعمال کرنا اس غرض کے منافی ہے جس کے لیے یہ پاک کلام

وَ اِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَ نَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا ﴿۸۳﴾

اور جب ہم انسان پر انعام کرتے ہیں تو وہ منہ پھیر لیتا ہے اور پہلوتہی کرتا ہے اور جب اسے برائی پہنچتی ہے تو ناامید ہو جاتا ہے۔ (1870)

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿۸۴﴾ ع

کہہ ہر ایک اپنے طریق پر عمل کرتا ہے سو تمہارا رب اسے خوب جانتا ہے جو سب سے بڑھ کر سیدھی راہ پر ہے۔ (1871)

وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ

اور تجھ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ روح

نازل ہوا۔ اور افسوس ہے کہ قوم تباہ ہو رہی ہے اور اس موت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے تو قرآن کریم کو استعمال نہیں کیا جاتا اور لغو موقعوں پر اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ کوئی چور دریافت کرنے کے لیے یٰسین پڑھ کر لوٹا گھماتا ہے، کوئی تعویذ لکھ کر بیماروں کو پلاتا ہے۔ اگر ان باتوں میں حق و حکمت ہوتی تو نبی ﷺ کو ان پر اطلاع دی جاتی اور احادیث میں ان کا ذکر ہوتا۔ اصل غرض یہ ہے کہ ہر ایک مسلمان مرد ہو یا عورت اسے پڑھے اور اس پر عمل کرے۔ اس پر عمل امراض جسمانی سے بھی بچاتا ہے اور آخر پر فرمایا کہ یہی قرآن جھٹلانے والوں کے لیے اور زیادہ ہلاکت کا موجب ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہر نیکی کے مقابل پر جو اس کے اندر سکھائی جاتی ہے وہ مخالفت کی وجہ سے اور زیادہ بدیوں کا ارتکاب کرتے ہیں یا اس کی مخالفت میں قدم بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔

1870 - اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح انعام کے وقت اعراض فعل مذموم ہے اسی طرح تکلیف کے وقت مایوسی بھی مذموم فعل ہے۔ رحمت الٰہی سے کبھی مایوس نہ ہو، خواہ کیسی بھی مصائب پیش آئیں۔

1871 - شَاكِلَةٌ۔ شَكَلٌ کے معنی شبہ یا مثل ہیں ﴿وَّ اٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ ؕ﴾ [صٓ: 58:38] ''اور اسی صورت کی اور (سزا) رنگا رنگ کی (موجود ہے)۔'' اور انسان کی شاکلۃ اس کی شکل اور اس کی جانب اور اس کا طریق ہے۔ (ل) اور مفردات میں ہے کہ شکال چونکہ اسے کہا جاتا ہے جس کے ساتھ جانور کو قید کیا جاتا ہے اس لیے شَاكِلَةٌ انسان کی وہ خصلت ہے جو اسے قید کیے ہوئے ہے۔ (غ) اور مفسرین نے طریق، طبیعت اور دین اس سے مراد لیے ہیں۔

جب اوپر دو گروہوں کا ذکر کیا ایک وہ جن کے لیے قرآن شفا ہو گیا، دوسرا وہ جو گھاٹے میں بڑھ رہا ہے۔ تو اب بتایا کہ ہر ایک اپنے اپنے طریق یا طبیعت پر عمل کرتا ہے۔ نتیجہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہدایت پر کون ہے۔ ان الفاظ کا مطلب یہ نکالنا کہ بعض انسان طبیعت کی رو سے ہی بدی کرنے پر مجبور کر دیئے گئے ہیں، قرآن کریم کی ساری تعلیم کو باطل کرتا ہے۔

مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ وَ مَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۸۵﴾ میرے رب کے حکم سے ہے اور تمہیں تھوڑا سا ہی علم دیا گیا ہے۔(1872)

1872- رُوۡح۔ [دیکھو نمبر: 111, 598 اور 774]۔

روح تین طرح پر ہے:

روح کو حکما نے دو طرح پر قرار دیا ہے۔ روح حیوانی اور روح انسانی یعنی نفس ناطقہ۔ اور قرآن کریم میں جو آدم میں نفخ روح کا ذکر ہے ﴿فَاِذَا سَوَّیۡتُہٗ وَ نَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ﴾ [الحجر: 29:15] ''سو جب میں اسے تکمیل کو پہنچاؤں اور اپنی روح اس میں پھونکوں۔'' تو وہ یہی روح انسانی ہی ہے جو حیوان سے انسان کو ممتاز کرتی ہے۔ کیونکہ حیوان آدم سے پیشتر بن چکے تھے اور ہر انسان میں جو نفخ روح کا ذکر ہے وہ بھی اسی معنی سے ہے ﴿ثُمَّ جَعَلَ نَسۡلَہٗ مِنۡ سُلٰلَۃٍ مِّنۡ مَّآءٍ مَّہِیۡنٍ ﴿۸﴾ ثُمَّ سَوّٰىہُ وَ نَفَخَ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِہٖ وَ جَعَلَ لَکُمُ السَّمۡعَ وَ الۡاَبۡصَارَ وَ الۡاَفۡـِٕدَۃَ﴾ [السجدۃ: 32:8-9] ''پھر اس کی نسل ایک نچوڑ سے ٹھہرائی (جو) کمزور پانی میں (آجاتا ہے)۔ پھر اسے ٹھیک بنایا اور اپنی روح اس میں پھونکی اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔'' اور تیسری قسم کی روح وحی الٰہی ہے ﴿یُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوۡحِ مِنۡ اَمۡرِہٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖۤ﴾ [النحل: 2:16] ''وہ فرشتوں کو وحی کے ساتھ اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اتارتا ہے۔'' کیوں کہ یہ خاص خاص بندوں پر نازل ہوتی ہے۔ اور اسی لحاظ سے قرآن کریم کو بھی روح کہا ہے ﴿وَ کَذٰلِکَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا﴾ [الشوریٰ: 52:42] ''اور اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے حکم سے روح بھیجی۔'' اور آخر الذکر دونوں مقامات پر جہاں وحی مراد ہے ﴿مِنۡ اَمۡرِہٖ﴾ اور ﴿مِّنۡ اَمۡرِنَا﴾ کے الفاظ بھی ساتھ بڑھائے ہیں جیسے یہاں فرمایا ﴿قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ﴾۔

یہاں سوال کس روح کے متعلق ہے؟ مفسرین نے پانچ اقوال لکھے ہیں: یعنی ① ارواح بنی آدم، ② جبریل (جن کو دوسری جگہ الروح الامین کے نام سے پکارا ہے) ③ ایک عظیم الشان فرشتہ، ④ فرشتے جو بنی آدم کی صورتوں پر ہیں، ⑤ وہ فرشتے جنہیں فرشتے بھی نہیں دیکھتے گو وہ انہیں دیکھتے ہیں۔ گویا وہ بلحاظ دیگر ملائکہ کے ایسے ہیں جیسے ملائکہ بلحاظ انسان کے۔ (ث) میرے نزدیک سوال عام ہے اور روح سے مراد روح حیوانی بھی ہے اور روح انسانی یا نفس ناطقہ بھی اور حیات اخروی والی روح یعنی وحی الٰہی بھی۔ اور تینوں کے متعلق فرمایا کہ وہ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ ہے یعنی وہ جو ربوبیت کرنے والا ہے اس کے امر خاص سے ہے اور تینوں پر اس لیے حاوی ہے کہ ربوبیت تینوں سے ہوتی ہے اور چونکہ انسان کی اصل ربوبیت جو اسے اس کے حقیقی کمال تک پہنچاتی ہے وحی الٰہی سے ہے۔ اس لیے اسی کے متعلق ذکر کو جاری رکھا ہے۔ جیسے اگلی آیت میں ﴿بِالَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ﴾ کے ذکر سے یا [آیت: 88] میں قرآن کے ذکر سے اور باقی دو اس کے اندر شامل ہیں۔ اور ان تینوں کی حقیقت یا کنہ کو انسان نہیں پہنچ سکتا اور بخاری کی حدیث یا دیگر احادیث میں جو ذکر ہے تو وہ بھی ہر سہ کے متعلق ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہود میں یہی لفظ روح کلام

وَ لَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیْنَا وَكِیْلًا ﴿۸۶﴾

اور اگر ہم چاہتے تو اسے لے جاتے جو ہم نے تیری طرف وحی کی پھر تو اپنے واسطے اس کے (لادینے کے) لیے ہمارے اوپر کوئی ذمہ لینے والا نہ پاتا۔ (1873)

اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَیْكَ كَبِیْرًا ﴿۸۷﴾

مگر یہ تیرے رب کی طرف سے رحمت ہے۔ اس کا فضل تجھ پر بہت بڑا ہے۔

الٰہی پر بولا جاتا تھا۔ البتہ یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا کہ یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی کیونکہ سورت مکی ہے اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا نزول مکہ میں ہی ہوا۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ یہود نے مدینہ میں سوال کیا ہو اور آنحضرت ﷺ نے یہ جواب ان کو دیا ہو جو پہلے کا نزول شدہ تھا اور اسی وقت وحی ہونا محض راوی کا ظن ہے۔ جیسا کہ ظنت کے استعمال سے ظاہر ہے۔ اور ﴿وَ مَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۸۵﴾﴾ میں بتایا کہ انسان کا علم بمقابلہ علم الٰہی کے کچھ بھی نہیں۔ انسان صرف چند اوپر اوپر کی باتوں کا علم حاصل کرسکتا ہے، ان کی کنہ تک پہنچنا اس کا کام نہیں۔

روح جسم کے ساتھ پیدا ہوتی ہے:

یہاں اس قدر اور بڑھا دینا ضروری ہے کہ یہ خیال کہ روحیں اللہ تعالیٰ نے پہلے سے پیدا کر کے رکھ چھوڑی ہیں صحیح نہیں۔ اور یہ حدیث کہ روحیں دو ہزار سال پیشتر پیدا ہوئیں اس کی اسناد صحیح نہیں جیسا کہ ابن قیم نے لکھا ہے۔ (د) کیونکہ دوسری حدیث میں ہے کہ انسان جب نطفہ پھر علقہ پھر مضغہ بنتا ہے تب اللہ تعالیٰ فرشتہ بھیجتا ہے جو اس میں روح پھونکتا ہے۔ اور روح المعانی میں یہ قول نقل کیا ہے کہ روحوں کا جسموں سے پہلے پیدا ہونا قول فاسد اور خطائے صریح ہے اور عقل اور شرح کے مطابق یہی امر ہے کہ روح جسم کے ساتھ پیدا ہوتی ہے اور یہی مذہب اہل تحقیق کا ہے۔ جیسا کہ امام غزالی نے بھی لکھا ہے۔

1873 - حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر سے تو سورت ہی شروع ہوئی تھی اور دیگر انبیاء کا اور ان کے متعلق سنت اللہ کا بھی ذکر آیا تھا اور ظاہر ہے کہ ہر نبی کے بعد دوسرا نبی آتا رہا اور پہلی کتابیں پچھلی کتاب کے آنے سے منسوخ ہوتی رہیں اور قرآن شریف کے آنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وحی کی ضرورت باقی نہ رہی اور یوں بھی پہلی تمام کتابوں میں تحریف ہوتی رہی۔ اس لیے فرمایا کہ یہ وحی جس کے ذریعہ سے اب ہم مخلوق کو حیات جاودانی دیتے ہیں اسے بھی اگر اللہ چاہتا تو پہلی وحیوں کی طرح لے جاتا پھر کوئی چیز اسے دنیا میں واپس نہ لاسکتی۔ لیکن مشیت الٰہی ایسی نہ تھی بلکہ اس مشیت کا تقاضا یہی تھا کہ یہ آخری وحی ہمیشہ کے لیے دنیا میں رہے اور آپ کے بعد کوئی کتاب نہ آئے، نہ کوئی نبی مبعوث ہو اور تمام لوگ اسی ایک نور سے روشنی حاصل کریں۔ اسی کی طرف اگلی آیت میں اشارہ ہے ﴿اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَیْكَ كَبِیْرًا ﴿۸۷﴾﴾۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿۸۸﴾

کہہ اگر انسان اور جن اس بات پر اکٹھے ہو جائیں کہ اس قرآن کی مانند بنا لائیں تو اس کی مانند نہ لا سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔ (1874)

وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۚ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۸۹﴾

اور یقیناً ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی نادر باتیں بار بار بیان کر دی ہیں۔ مگر اکثر لوگوں کو سوائے انکار کے کچھ منظور نہیں۔ (1875)

وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴿۹۰﴾

اور کہتے ہیں ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ تو ہمارے لیے اس زمین سے چشمہ بہا دے۔ (1876)

1874 - **قرآن کی عظمت:** جب قرآن کے دنیا میں ہمیشہ باقی رہنے کا اور آخری کتاب ہونے کا ذکر کیا تو اب اس کی عظمت کی طرف بھی توجہ دلائی۔ تمام دنیا کے انسان اس کی مثل نہیں لا سکتے نہ پہلی کتابوں سے نہ نئی بنا کر۔ پس جس کی نظیر دنیا نہیں بنا سکتی اس کو اللہ تعالیٰ بھی ضائع نہیں کرے گا [دیکھو نمبر: 37]۔ مگر جہاں سورہ بقرہ میں ﴿وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ﴾ [البقرۃ: 23:2] ''اپنے مددگاروں کو بلا لو'' فرمایا، یہاں فرمایا کہ انسان اور جن اکٹھے ہوں اور ایک دوسرے کی مدد کریں۔ جس سے معلوم ہوا کہ وہی ان کے شہداء یا پیشرو ہی ہیں جنہیں اس مکی سورۃ میں جن کے نام سے پکارا ہے۔

1875 - مِثْل کے معنی حُجَّۃٌ یعنی دلیل اور حدیث یعنی بات اور صفت آئے ہیں۔ (ت) اور روح المعانی میں مثل کے معنی یہاں دیئے ہیں ہر ایک معنی جو حسن میں اور نادر ہونے میں اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لینے میں بدیع یعنی بے مثال ہو۔

قرآن کی عظمت کی اور اس کے ہمیشہ تک رہنے کی یہاں دلیل دی کہ اس میں ہر قسم کی باتیں بار بار اور کھول کھول کر بیان کر دی گئی ہیں۔ مذہب کے معاملہ میں کوئی ایسی بات نہیں جو یہاں نہ ہو اور دوسری جگہ ہو۔

1876 - يَنْبُوْعَ۔ نَبَعَ چشمہ سے پانی کا نکلنا ہے اور يَنْبُوْعَ (جمع ینابیع) چشمہ کو کہتے ہیں ﴿فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ﴾ [الزمر: 21:39] ''پھر اسے چشمے بنا کر چلاتا ہے۔'' (غ)

روحانی انعامات کو جسمانی رنگ میں دیکھنے کی درخواست:

باوجود قرآن شریف کی اس عظمت کے، اس کے ہدایت میں بے مثل ہونے اور اس کی تعلیم کے کمال کے اس کا تو انکار کیا جاتا

اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿۹۱﴾	یا تیرا کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو۔ پھر تو اس کے اندر خوب نہریں بہا نکالے۔
اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴿۹۲﴾	یا تُو آسمان کو جیسا کہا کرتا ہے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر گرادے یا تو اللہ اور فرشتوں کو سامنے لے آ۔ (1877)

ہے اور مطالبہ یہ کیا جاتا ہے کہ مکہ کی زمین سے ایک چشمہ پھوٹ نکلے۔ چونکہ راستبازوں کے لیے جنات وانہار کے وعدے تھے اور مخالفین پر عذاب کے آنے کے۔ اس لیے مطالبات بھی قریباً اسی رنگ کے ہیں۔ چشمے اور نہریں اور باغ ہوں جن میں رسول اللہ ﷺ رہیں یا مخالفوں پر آسمان ٹوٹ پڑے۔ وہ نعماء جن کا روحانی طور پر وعدہ دیا گیا تھا انہیں جسمانی رنگ میں اس دنیا میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہی حالت آج بھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان فتوحات میں جو مسلمانوں کو عطا فرمائیں ایک رنگ ظاہری بھی ان نعمائے روحانی کا دکھا دیا۔ مکہ معظّمہ میں پانی کا چشمہ بھی بہہ نکلا یعنی وہ نہر جواب وہاں بہتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ باغوں اور نہروں کے مالک بھی ہوئے، مخالفوں پر آسمان بھی ٹوٹا مگر نہ اس رنگ میں جیسے وہ چاہتے تھے جس کی وجہ رکوع کی آخری آیت میں بتائی ہے۔

1877- ﴿كِسَفًا﴾۔ كِسَفَةٌ کی جمع كِسَفٌ سے ہے اور كِسَفَةٌ بادل کے ٹکڑے کو کہتے ہیں یا روئی کے اور اجسام کے جن کے اجزا ایک دوسرے سے مضبوط طور پر پیوستہ نہ ہوں اور ان میں ردوبدل ہوتا رہے ﴿وَ يَجْعَلُهٗ كِسَفًا﴾ [الروم: 48:30] ''اور اسے تہ بتہ کر دیتا ہے۔'' ﴿فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ [الشعرآء: 187:26] ''سو ہم پر کوئی آسمان کا ٹکڑا گرادے۔'' (غ)

قَبِيْلَ۔ قَبِيْلَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی جماعت ہیں۔ پس یہاں مراد ہے جماعت جماعت کر کے یا قَبِيْلًا کے معنی مُقَابِلَةٌ یعنی آنکھوں کے سامنے۔ (غ)

عذاب کا ذکر استعارہ کے رنگ میں:

یہ وہی عذاب ہیں جن کے ان کو وعدے دیئے جاتے تھے مگر جیسا کہ لفظ كِسَف کا استعمال بتاتا ہے مراد یہ نہ تھی کہ آسمان کوئی ٹھوس چیز ہے جس کا ایک بڑا سا ٹکڑا ان پر گر کر انہیں تباہ کر دے گا جیسا انہوں نے سمجھا۔ بلکہ اس سے مراد اوپر سے کسی عذاب کا آنا تھا۔ ہوا کے رنگ میں ہو یا بادل کے۔ اللہ اور فرشتوں کا آنا بھی حق تھا مگر نہ اس رنگ میں جیسا انہوں نے خیال کیا۔ یعنی ظاہر طور پر نہیں [دیکھو نمبر: 269]۔ مادہ پرستوں کی نظریں بھی لفظوں کے قشر تک محدود رہتی ہیں اور وہ اصل حقیقت پر غور نہیں کرتے۔

اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۳﴾ ع 10 9 10	یا تیرا سونے کا گھر ہو یا تو آسمان میں چڑھ جائے اور ہم تیرے چڑھنے کو بھی نہیں مانیں گے جب تک کہ تو ہم پر کتاب نہ اتارے جسے ہم پڑھ لیں۔ کہہ میرا رب پاک ہے میں صرف ایک بشر رسول ہوں۔ (1878)

1878 - ﴿تَرْقٰى﴾۔ رَقِیَ ماضی ہے اور رُقِیٌّ مصدر اور اس کے معنی سیڑھی یا زینہ پر چڑھنا ہیں اور اسی سے ارتقاء ہے ﴿فَلْيَرْتَقُوْا فِي الْاَسْبَابِ﴾[صٓ: 10:38] ''تو چاہیے کہ وہ ذریعے بنا کر اوپر چڑھ جائیں۔''

کفار کے مطالبات میں لفظ پرستی:

سونے کا گھر ہو، یعنی زمین پر ہی عام انسانوں سے کوئی امتیاز ہو یا خدا سے باتیں کرنے کا دعویٰ ہے تو آسمان پر چڑھ کر دکھاؤ اور چڑھنا بھی دیکھ لیں تو بھی نہیں مانیں گے جب تک اوپر سے خدا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب لا کر نہ دکھاؤ۔ ان تمام مطالبات میں وہی ایک ہی رنگ نظر آتا ہے یعنی لفظ پرستی اور اصل حقیقت کی طرف توجہ نہ کرنا۔ قرآن شریف میں دوسری جگہ فرمایا ہے کہ ہمارے ہاں سونے اور چاندی کی کچھ بھی وقعت نہیں اور اگر لوگوں کے فتنہ میں پڑ جانے کا احتمال نہ ہوتا تو کافروں کے چاندی سونے کے گھر بنا دیتے ﴿لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ لِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ﴿۳۴﴾ وَ زُخْرُفًا ؕ﴾[الزخرف: 43:33-35] ''تو ہم ان کے لیے جو رحمٰن کا انکار کرتے ہیں ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے اور سیڑھیاں (بھی) جن پر وہ چڑھتے۔ اور ان کے گھروں کے دروازے اور تخت جن پر وہ تکیہ لگاتے ہیں۔ اور سونے کے (بھی)۔'' تو لفظ پرست کہتے ہیں کہ تمہارے رب کے ہاں اتنی بہتات سونے کی ہے تو پہلے تمہارا گھر ہی سونے کا بن لے۔ اور اسی سورت میں آپ کے معراج کا یعنی آسمانوں کے عجائبات کے دیکھنے کا ذکر ہے۔ تو اس لیے کہتے ہیں کہ ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ کر دکھاؤ اور یہ جو تم کہتے ہو کہ وہاں سے احکام الٰہی لایا ہوں تو اوپر سے ہی تمہارے ساتھ کوئی کتاب بھی آئے جس میں وہ احکام لکھے ہوئے ہوں۔ غرض باتیں تو وہی ہیں جو قرآن شریف نے فرمائیں لیکن ایک لفظ پرست قوم نے بجائے حقیقت کی طرف توجہ کرنے کے لفظوں پر اعتراض شروع کر دیئے۔ ان سب کا جواب ایک ہی دیا ہے کہ میں بشر رسول ہوں اور اللہ تعالیٰ کی ذات عیب سے پاک ہے۔ یعنی وہ خدا جسم نہیں کہ آسمان پر چڑھ کر اس تک پہنچ سکیں اور اس کا کلام بھی یوں سنا یا دیکھا نہیں جاتا۔ بلکہ اس کے لیے دوسرے غیر مادی اور روحانی حواس بکار ہیں جو ان حواس کے نقصوں سے خالی ہوں اور اس کی تمام باتیں پوری ہوئیں اور ہوں گی مگر نہ اس طرح پر جس طرح کہ تم چاہتے ہو۔ اسی سورت میں معراج کا ذکر ہونے کے باوجود کفار کے اس مطالبہ کا ذکر کہ تم آسمان پر چڑھ جاؤ صاف بتاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا معراج روحانی تھا اور جسمانی طور پر آسمان پر چڑھنا بشریت کے منافی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے سبحان ہونے کے بھی منافی

وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۴﴾

اور لوگوں کو کوئی چیز ایمان لانے سے مانع نہیں ہوتی جب ان کے پاس ہدایت آئی مگر یہ کہ انہوں نے کہا کیا اللہ نے ایک انسان کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾

کہہ اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چلتے پھرتے تو ضرور ہم ان پر آسمان سے فرشتہ رسول بنا کر بھیجتے۔ (1879)

ہے۔ کیونکہ اس صورت میں ماننا پڑے گا کہ خدا بھی ایک جسم ہے اور یہ اس میں عیب کا ماننا ہے۔

1879 - ﴿مُطْمَئِنِّیْنَ﴾۔ اطمینان کے معنی ہیں خوف کے بعد سکون (غ) اور یہاں ظاہری قرار یا سکونت اختیار کرنا مراد ہے۔

بشریت رسول کا مضمون جاری رکھ کر فرمایا ہے کہ انسان کے لیے انسان ہی رسول ہوسکتا تھا اور جو انسان ہوگا اس کے ساتھ لوازم بشریت بھی ہوں گے۔ یہ روحانی امور کو جسمانی رنگ میں دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ اس لیے کہتے ہیں کہ فرشتے ان کو نظر آئیں۔ مگر فرشتے انسانوں کی طرف رسول بن کر نہیں آسکتے کیونکہ رسول کا کام تو ہے ہی نمونہ دکھانا۔ اور نمونہ جنس ہی جنس کے لیے ہوسکتی ہے نہ غیر جنس۔ انسانوں کی جگہ فرشتے زمین پر آباد ہوتے تو فرشتے ہی ان کی طرف رسول بن کر آتے اور خود پیغمبر پر فرشتہ کا آنا اس کے منافی نہیں۔ کیونکہ پیغمبر فرشتہ کو ان حواس جسمانی سے نہیں بلکہ حواس روحانی سے دیکھتا ہے۔ انہی حواس سے جن حواس سے وہ اللہ تعالیٰ کا کلام سنتا ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان کے یہ حواس جسمانی فرشتوں کو نہیں دیکھ سکتے بلکہ وہ روحانی حواس کے ساتھ دیکھے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ اس بات کو بشریت کے منافی قرار دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ جو ملائکہ کو دیکھتے تھے اور حضرت جبریل علیہ السلام شب و روز آپ کے پاس آتے تھے تو وہ وہی حواس انبیاء سے دیکھنا تھا اور حضرت جبریل علیہ السلام کو دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ یا کسی اعرابی کی شکل میں صحابہ کا دیکھنا اس آیت کے خلاف نہیں ہوسکتا اور وہ بھی ایک کشفی نظارہ ہی ہوسکتا ہے جس میں دوسرے صحابہ بھی بہ سبب زبردست قوت کشفی نبوی کے شامل ہوگئے۔ جس طرح پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بعض وقت وحی کی آواز کی بھنبھناہٹ کو سن لینا روایات سے معلوم ہوتا ہے۔

اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس طرح فرشتہ انسانوں کی طرف رسول نہیں ہوسکتا اسی طرح انسان فرشتوں کی طرف رسول نہیں ہوسکتا۔ نہ جنوں کی طرف جو انسان کی جنس سے نہیں بلکہ دوسری جنس کی غیر مرئی ہستیاں ہیں۔ جس جنس کو اپنی تکمیل کے لیے رسول کی ضرورت ہے اس رسول کا اسی جنس میں سے ہونا ضروری ہے اور رسول اللہ ﷺ کے پاس جنوں کے آنے سے اور

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۹۶﴾

کہہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان کافی گواہ ہے۔ کیونکہ وہ اپنے بندوں سے خبردار (انہیں) دیکھنے والا ہے۔ (1880)

وَ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَ نَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا ؕ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴿۹۷﴾

اور جسے اللہ ہدایت دے تو وہی ہدایت پانے والا ہے۔ اور جسے وہ گمراہ ٹھہرائے تو تُو ان کے لیے اس کے سوائے اور کوئی حمایتی نہ پائے گا اور ہم انہیں قیامت کے دن تک ان کے مونہوں کے بل (گرتے ہوئے) اکٹھا کریں گے اندھے اور گونگے اور بہرے۔ ان کا ٹھکانا دوزخ ہے جب کبھی وہ آگ بجھنے لگے گی ہم ان پر اور زیادہ بھڑکا دیں گے۔ (1881)

قرآن کو سننے اور اس پر ایمان لانے سے کیا مراد ہے اس پر آئندہ اپنے موقعہ پر بحث ہوگی۔

1880 - اللہ تعالیٰ کی شہادت سے مراد اپنے فعل سے حق کے حق اور باطل کے باطل ہونے پر گواہی دینا ہے یعنی حق دنیا میں قائم ہوتا چلا جاتا اور باطل جو اس کو نابود کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ خود باطل ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسی لیے خَبِیْر اور بَصِیْر کی صفات آخر میں لائی گئی ہیں۔

1881 - ﴿فَهُوَ الْمُهْتَدِ﴾ مراد یہ ہے کہ وہی شخص ایسے راستہ پر چلتا ہے جو اسے منزل مقصود تک پہنچا دے۔ اس کے مقابل پر وہ ہے جو گمراہی میں اس قدر دور نکل گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر گمراہ ہونے کا فرد جرم لگا دیا۔ اب اس کی سزا سے اللہ کے مقابلہ پر اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔

﴿عَلٰى وُجُوْهِهِمْ﴾ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ لوگوں کا حشر ان کے مونہوں کے بل کس طرح ہوگا۔ تو آپ نے فرمایا جو انہیں پاؤں پر چلانے پر قادر ہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ انہیں مونہوں پر چلائے۔ اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ لوگوں کا حشر تین گروہوں میں ہوگا۔ ایک وہ جو سوار ہوں گے اور ایک وہ جو چلتے اور دوڑتے ہوں گے اور ایک وہ جنہیں فرشتے ان کے مونہوں کے بل گھسیٹتے ہوں گے۔ اور قرآن کریم میں ہے ﴿يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ﴾ [القمر: 48:54] ''جس دن آگ کے اندر اپنے مونہوں کے بل گھسیٹے جائیں گے۔'' اور قرآن کریم میں ایک جگہ یوں بھی ہے ﴿اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۲﴾﴾ [الملك: 22:67] ''تو کیا وہ جو اپنے منہ کے بل اوندھا چلتا ہے زیادہ ہدایت پر ہے یا وہ جو سیدھا راہ راست پر چلتا ہے؟'' یہاں مراد یہ

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ قَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۹۸﴾

یہ ان کی سزا ہے اس لیے کہ وہ ہماری باتوں کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کیا جب ہم ہڈیاں اور چورا ہو جائیں گے تو نئی پیدائش میں اٹھائے جائیں گے۔

اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَ جَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۹۹﴾

کیا وہ غور نہیں کرتے کہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس بات پر قادر ہے کہ ان جیسے پیدا کرے اور اس نے ان کے لیے ایک میعاد ٹھہرائی ہے جس میں کوئی شک نہیں مگر ظالموں کو سوائے انکار کے کچھ منظور نہیں۔ (1882)

ہے کہ جو شخص قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا اور منہ کے بل گرتا ہے کیا وہ اس راہ پر ہے جو اسے منزل مقصود تک پہنچا دے گی۔ اور چونکہ قرآن کریم میں سزا کو ﴿جَزَآءً وِّفَاقًا﴾ [النبأ: 26:78] ''بدلہ موافق (اعمال ہے)۔'' قرار دیا ہے اس لیے جو لوگ یہاں سیدھی راہ اختیار نہیں کرتے بلکہ غلط راہ اختیار کر کے منہ کے بل گرتے ہیں ان کی سزا بھی ویسی ہی ہے جس طرح یہاں اندھے رہنے کی وجہ سے قیامت میں اندھے ہوں گے اور یہاں حق کی طرف سے بہرہ ہونے کی وجہ سے وہاں بہرے ہوں گے۔ حالانکہ یہی اندھے وہاں دیکھیں گے بھی اور یہی بہرے وہاں سنیں گے بھی اور یہی گونگے وہاں بولیں گے بھی۔ گویا سزا کا ذکر انہیں الفاظ میں کیا ہے جو الفاظ ان کی غلط کاریوں کے لیے استعمال کیے ہیں۔ اور حدیث جو اوپر دی گئی ہے اس سے خود ظاہر ہے کہ جس طرح سوار ہونا، چلنا بطور استعارہ ہے گھوڑوں یا ریلوں پر سوار ہونا مراد نہیں۔ اسی طرح مونہوں کے بل گرنا بھی بطور استعارہ ہے جس طرح انہوں نے انسان کی زندگی کے اشرف اور بلند تر مقصد کو اپنے پاؤں کے نیچے رکھا، اسی طرح ان کا اشرف حصہ وہاں ان کے پاؤں بنے گا۔

خَبَتْ۔ خَبَوْ سے ہے اور خِبَاء اصل میں پردہ کو کہتے ہیں جو کسی چیز پر ڈال دیا جائے۔ اس لیے جلتی آگ پر جب خاکستر کا پردہ آ کر اس کے شعلہ کو ساکن کر دیتا ہے تو اس پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ (غ)

آگ کا بجھنا اور پھر اس کا بھڑکایا جانا اسی کی مثال ہے جیسے فرمایا ﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا﴾ [النسآء: 56:4] ''جب ان کی کھالیں پک جائیں گی ہم ان کی جگہ ان کو اور کھالیں دے دیں گے۔'' اور مطلب یہ ہے کہ وہ عذاب قائم رہے گا۔ وہ ایسی آگ نہیں کہ ایک دفعہ جلا دی تو خود بخود اس پر خاکستر کا پردہ آ کر آگ بجھ جائے گی بلکہ اس کا اثر برابر قائم رہے گا۔ جس طرح وہ مخالفت کی آگ بار بار بھڑکاتے تھے اسی طرح ان سے معاملہ ہوگا۔

1882 - **حیات بعد الموت میں یہی جسم نہ ہوگا بلکہ اس کی مثل ہوگا:** یہاں حیات بعد الموت کو قیامت میں اٹھایا جانے کو

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّیْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْیَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴿۱۰۰﴾ ع 11 8 11

کہہ اگر تم میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تو تب تم ان کے خرچ ہوجانے کے ڈر سے (انہیں) روک رکھتے اور انسان تنگ دل ہے۔ (1883)

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰی مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾

اور یقیناً ہم نے موسیٰ کو نو کھلے نشان دیئے۔ سو بنی اسرائیل سے پوچھ جب وہ ان کے پاس آیا۔ تو فرعون کے اسے کہا اے موسیٰ میں سمجھتا ہوں کہ تجھ پر جادو کیا گیا ہے۔ (1884)

مِثْلَهُمْ قرار دیا ہے یعنی انہی انسانوں کی مثل جس سے معلوم ہوا کہ وہ بالکل یہی جسم نہیں اور یہ جسم تو ہر آن بدلتا بھی رہتا ہے۔ بلکہ اس کی مثل ہے اور مثل کا لفظ اس لیے بھی موزوں ہے کہ جزا اور سزا مطابق اعمال ہے اور اجل کا ذکر اس لحاظ سے کیا کہ یہ جسم ایک وقت مقرر کے بعد فنا ہوجاتا ہے۔ لیکن اعمال فنا نہیں ہوتے۔

1883 - اِنْفَاقٌ سے مراد یہاں مال کا جاتے رہنا یا ختم ہوجانا ہے [دیکھو نمبر: 13]۔ اس آیت کا تعلق ماقبل سے کیا ہے۔ بعض نے اسے ان کے ان سوالات کے متعلق قرار دیا ہے کہ تمہارے لیے باغ اور نہریں اور سونے کا گھر ہو۔ تو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ یہ چیزیں بھی اللہ تعالیٰ دے دے گا۔ وہ بروں کو دے دیتا ہے تو اچھوں کو کیوں نہ دے گا۔ انسان کی طرح وہ بخیل نہیں۔ مگر زیادہ تر قرین قیاس یہ ہے کہ رحمت ربی میں اشارہ اس رحمت کی طرف ہے جو بذریعہ وحی انسانوں پر نازل ہوتی ہے اور مراد یہ ظاہر کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں سے بڑھ کر دوسری نعمتیں ہیں اور وہ یہ بھی دیتا جاتا ہے، وہ بھی اسے ختم ہوجانے کا خوف نہیں کیونکہ اس کے خزانے بے انتہا ہیں اور یہ اشارہ رسول اللہ ﷺ کی کامیابیوں کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے آپ کو بڑے بڑے سامان اور بادشاہتیں دے دے گا کیونکہ مالک وہ ہے تم نہیں ہو۔

1884 - **تِسْعَ اٰیٰتٍ سے مراد:** ایک حدیث میں ہے کہ دو یہودیوں نے آنحضرت ﷺ سے تسع آیات کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے نو احکام بیان فرمائے یعنی شرک نہ کرو، چوری نہ کرو، زنا نہ کرو وغیرہ جو شریعت موسوی کی بنیاد کے طور پر ہیں۔ مگر کئی وجوہ سے یہ حدیث قابل قبول نہیں۔ گو ترمذی، ابن ماجہ اور امام احمد نے اسے لیا ہے اس لیے کہ اول تو یہ احکام دس تھے، دوسرے یہ احکام بنی اسرائیل کو بعد میں دیئے گئے۔ جب مصر سے وہ ارض مقدس کی طرف چلے گئے۔ اور یہاں ان کے متعلق صاف فرعون کا ذکر ہے۔ تیسرے اگلی آیت میں صاف طور پر انہیں بصائر یعنی دلائل صداقت حضرت موسیٰ قرار دیا ہے اور دلائل صداقت تعلیم نہیں بلکہ معجزات ہوسکتے ہیں۔ اس لیے ﴿تِسْعَ اٰیٰتٍ﴾ سے مراد وہی نو نشان ہیں جن کا ذکر سورہ الاعراف میں ہے [دیکھو نمبر: 1143] مَسْحُوْر کے لیے [دیکھو نمبر: 1839] اور اس کے معنی مجنون بھی ہوسکتے ہیں۔ اور دوسری جگہ ہے ﴿اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْٓ اُرْسِلَ

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآىِٕرَ ۚ وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾

اس نے کہا تو خوب جانتا ہے کہ یہ آسمانوں اور زمین کے رب کے سوائے اور کسی نے نہیں اتارے روشن دلائل کے طور پر اور میں اے فرعون تجھے ہلاک شدہ خیال کرتا ہوں۔ (1885)

فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا ﴿۱۰۳﴾

سو اس نے چاہا کہ انہیں زمین میں خفیف کر دے، سو ہم نے اسے غرق کر دیا اور ان سب کو بھی جو اس کے ساتھ تھے۔

وَّ قُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًا ﴿۱۰۴﴾

اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہا (وعدے کی) زمین میں آباد ہو جاؤ، پھر جب پچھلا وعدہ آئے گا ہم تمہیں اکٹھا کر لائیں گے۔ (1886)

اِلَیْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۲۷﴾ [الشعرآء: 27:26] ''تمہارا رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے یقیناً مجنون نہیں ہے۔''

1885 - مَثْبُوْرٌ۔ ثَبَرٌ کے معنی حبس یعنی روکنا ہیں۔ (ل) اور ثبور کے معنی ہلاک اور فساد کے ہیں جو لازم حال ہو جائے ﴿دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا﴾ [الفرقان: 13:25] ''تو وہاں ہلاکت کو پکاریں گے۔'' اور ثبور ہلاک شدہ ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے کہ اس کے معنی ناقص العقل ہیں کیونکہ یہی سب سے بڑی ہلاکت ہے۔ (غ)

1886 - لَفِیْف۔ لَفَفٌ ران پر گوشت کی کثرت کو کہتے ہیں اور لَفِیْفٌ کے معنی ہیں جمع عظیم جو طرح طرح کے لوگوں سے مل کر بنی ہوئی ہو۔ جن میں شریف اور کمینے اور فرمانبردار اور عاصی اور قوی اور ضعیف ہوں۔ (ل) اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کے معنی جَمِیْعًا کیے ہیں۔ (ج) اور ﴿جَنّٰتٍ اَلْفَافًا﴾ [النبأ: 16:78] ''اور گھنے باغ۔'' میں اَلْفَافٌ سے مراد درختوں کی کثرت ہے۔ (ل)

یہاں مراد ﴿وَعْدُ الْاٰخِرَةِ﴾ سے قیامت کا آنا لیا گیا ہے۔ گویا مطلب یہ ہے کہ تم سب ہمارے حضور ملے جلے آؤ گے تو ہم تم میں فیصلہ کریں گے۔ لیکن اس کے بعد فوراً آتا ہے ﴿وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ﴾ جس میں ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کا ہے۔ اس لیے ﴿وَعْدُ الْاٰخِرَةِ﴾ سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا آنا بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ خاص وعدہ تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا گیا تھا اور اس کی تائید نہ صرف اگلی آیت سے ہوتی ہے بلکہ آگے چل کر پھر اسی وعدے کا ذکر کیا ہے ﴿اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا﴾ [108] اور اس کے کہنے والے ﴿اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ ہیں اور اس صورت میں اکٹھا کر لانے سے مراد یہ ہے کہ

وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ﴿۱۰۵﴾ وقف لازم

اور ہم نے اسے حق کے ساتھ اتارا اور وہ حق کے ساتھ اترا اور ہم نے تجھے صرف خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِیْلًا ﴿۱۰۶﴾

اور قرآن کو ہم نے جدا جدا کر دیا ہے تاکہ تو اسے ٹھہر ٹھہر کر لوگوں پر پڑھے اور ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے۔ (1887)

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿۱۰۷﴾

کہہ اسے مانو یا نہ مانو جن لوگوں کو اس سے پہلے علم دیا گیا ہے، جب یہ ان پر پڑھا جاتا ہے وہ تھوڑیوں کے بل سجدہ کرتے ہوئے گر پڑتے ہیں۔

تم کو اس پاک سرزمین سے یعنی ارض مقدس سے بے دخل کر دیا جائے گا یا سلسلہ بنی اسرائیل ختم ہو جائے گا اور ایک نیا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

1887 - فَرَقْنٰهُ۔ فَرَقٌ کے اصل معنی دو چیزوں کا الگ الگ کرنا ہیں۔ پس یہاں دو طرح پر معنی ہو سکتے ہیں کھول کھول کر بیان کیا یعنی اس کے احکام کو تفصیل کے ساتھ الگ الگ کر دیا۔ یا تھوڑا تھوڑا کر کے یعنی الگ الگ ٹکڑوں میں نازل کیا۔ (غ)

مُكْثٍ۔ مُكْثٍ کے معنی ہیں [ثُبَاتَ مَعَ اِنْتِظَارٍ] یعنی انتظار کرتے ہوئے ٹھہرے رہنا ﴿قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا﴾ [القصص: 29:28] ''تو اپنے گھر والوں سے کہا ٹھہرو!'' ﴿فَمَكَثَ غَیْرَ بَعِیْدٍ﴾ [النمل: 22:27] ''سو بہت دیر نہ ٹھہرا۔'' (غ) تَنْزِیْل کے لیے [دیکھو نمبر: 123]۔

قرآن کریم کا بتدریج نزول:

قرآن کریم تھوڑا تھوڑا کر کے 23 سال کے عرصہ میں نازل ہوا۔ یہاں اس کا ذکر بلحاظ اس کی عظمت کے ہے۔ کیونکہ اس میں ہر قسم کی تعلیم تھی۔ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کرنے میں حفظ اور فہم دونوں میں مدد ملتی تھی۔ اور تَنْزِیْلًا میں اشارہ ہے کہ مصالح کے مطابق تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا اور دوسری جگہ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کرنے کی حکمت کو یوں بیان فرمایا ﴿لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ﴾ [الفرقان: 32:25] ''تاکہ ہم اس کے ساتھ تیرے دل کو مضبوط کرتے رہیں۔''

وَّ يَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۸﴾

اور کہتے ہیں ہمارا رب پاک ہے، یقیناً ہمارے رب کا وعدہ پورا ہونا تھا۔

وَ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَ يَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴿۱۰۹﴾ السجدة 4

اور وہ تھوڑیوں کے بل گر پڑتے ہیں، روتے ہیں اور یہ ان کی عاجزی بڑھاتا ہے۔ (1888)

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ وَ لَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَ لَا تُخَافِتْ بِهَا وَ ابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۱۰﴾

کہہ اللہ کا پکارو یا رحمٰن کو پکارو، جس نام سے پکارو اس کے سب نام اچھے ہیں اور پکار پکار کر دعا نہ کر اور نہ چپکا ہی رہ اور اس کے بیچ بیچ ایک طریق اختیار کر۔ (1889)

1888 - اَذْقَانِ۔ ذَقَنٌ کی جمع ہے ٹھوڑی۔ (غ) (خِرّ کے لیے [دیکھو نمبر: 1578]) اور یہاں جزو سے کل مراد لے کر منہ مراد لیا گیا ہے۔ (ر)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی:

کوئی ایمان لائے یا نہ لائے مگر جو شخص ﴿اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ کا مصداق ہے اور علم کی بات کے سامنے نفس کی ہوا و ہوس کو چھوڑ دیتا ہے وہ انکار نہیں کر سکتا کہ بے شک وہ وعدہ جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے کیا تھا [استثناء: 18:15-18] وہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات بابرکات میں ہی پورا ہوا اور اگر آپ نہ آتے تو وہ وعدہ بھی پورا نہ ہوتا۔ دوبار گرنے میں نماز کے دو سجدوں کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔ اور اصل مراد یہ ہے کہ جب وعدۂ الٰہی کے پورا ہونے پر وہ سجدہ شکر بجالاتے ہیں تو پھر ایک ایسا سرور قرآن کے ساتھ ان کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے کہ اس سے بھر کر پھر دوبارہ خدا کے حضور گر جاتے ہیں گویا ان کا علم و یقین اور ترقی کر جاتا ہے۔

1889 - ﴿تُخَافِتْ﴾۔ خَفَتٌ اور خَفَاتٌ بھوک سے جو کمزوری پیدا ہو یا آواز کی کمزوری کو کہتے ہیں اور جب موت کے ساتھ انسان کا کلام منقطع ہو جاتا ہے اور وہ خاموش ہو جاتا ہے تو اسے خَافِتٌ کہتے ہیں اور بات کے چھپانے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے ﴿يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ﴾ [طٰہٰ: 20:103] ''آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کریں گے۔'' (ل)

اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت میں تمام مذاہب باطلہ نے ٹھوکر کھائی ہے۔ عرب کے بت پرست بھی، عیسائی قوم کی طرح صفت رحمانیت یعنی رحم بلا بدل کو نہ مانتے تھے اور گو سورت میں ذکر بنی اسرائیل کا تھا مگر چونکہ ان سے پھیر کر اب عیسائیت کی طرف ذکر کو لاتا ہے جس پر سلسلہ موسوی ختم ہوتا ہے اس لیے اس آیت میں اور اگلی آیت میں صاف طور پر عیسائی عقیدہ کا ذکر کیا ہے۔ اور تفاسیر میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ مکہ میں آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ سے یا اللہ یا رحمٰن کہہ

وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا ﴿۱۱۱﴾ ع 12 11 12

اور کہہ سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے بیٹا نہیں بنایا اور نہ بادشاہی میں اس کا کوئی شریک ہے اور نہ وہ عاجز ہے کہ اس کا کوئی مددگار ہو اور اس کی بڑائی بیان کر جو حق بڑائی بیان کرنے کا ہے۔ (1890)

کر دعا کرتے تھے تو مشرکوں نے کہا کہ ہمیں دو خدا پکارنے سے روکتے ہیں اور آپ دو خداؤں کو پکارتے ہیں۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ یہ ایک ہی ذات واحد کے اسماء ہیں یعنی اس کی مختلف صفات کے لحاظ سے اس کے نام ہیں۔ اور اصل میں یہاں یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور خضوع وخشوع سے اور اپنے آپ کو اس کے اسمائے حسنیٰ کے ماتحت لانے سے انسان اپنے کمال کو حاصل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سب صفات ہی خوبصورت ہیں۔ جس صفت کو انسان اپنے اندر لینے کی کوشش کرے اسی سے اس کے اندر حسن پیدا ہوگا۔

اور صلوت کا لفظ جو یہاں آیا ہے تو اس کے معنی دعا ہے [دیکھو نمبر: 12] گو بخاری میں دونوں قسم کی احادیث ہیں۔ یعنی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کہ اس آیت کا نزول قراءت کے بارہ میں ہے یعنی نماز کی قراءت کے اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کہ یہ عام دعا کے بارہ میں ہے اور دوسری روایات میں مجاہد اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی تفسیر مروی ہے۔ (ر) اور سیاق مضمون اس کے دعا کے بارہ میں ہونے کو ہی صحیح ٹھہراتا ہے کیونکہ اوپر صاف ذکر دعا کا ہے۔ یعنی جب یہ ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے اسماء حسنیٰ سے پکارو تو اب یہ بھی بتایا کہ اللہ سے دعا کرنے میں میانہ روی اختیار کرو۔ نہ تو اس قدر چیخ کر پکارو کہ گویا خدا بلند آواز کو ہی سنتا ہے اور نہ ہی یہ سمجھ کر کہ اللہ تعالیٰ تو دل کی باتوں کو جانتا ہے منہ سے کچھ کہنے کی کیا ضرورت ہے، بالکل خاموشی اختیار کرو۔ دعا کے معاملہ میں بھی لوگوں نے افراط وتفریط سے کام لیا ہے۔ دعا میں زیادہ چلانا ادب کے خلاف ہے اور بغیر الفاظ کے دعا کا اثر قلب پر نہیں پڑتا اور نہ اس میں وہ گڑگڑاہٹ پیدا ہوتی ہے جو اسے قبولیت کے مقام پر پہنچائے۔ اور صلوٰۃ کے معنی نماز لے کر قراءت ہی مراد لی جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ نہ تو ساری قراءت بالجہر ہو اور نہ ساری آہستہ ہو بلکہ ان کے درمیان چلو۔ یعنی کچھ حصہ بالجہر ہوتا کہ اس حالت میں سب کے سب ایک ہی طرح پر خدا کی عظمت کے آگے سر جھکائے ہوئے ہوں اور ایک حصہ آہستگی سے ہوتا کہ ہر شخص اپنے رنگ میں خدا کے رنگ میں خدا کے خیال میں محو ہو۔

1890 - **توحید الٰہی:** سورت کا خاتمہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی کرنے پر کیا ہے۔ جیسا کہ ابتدا اس کی سبوحیت سے کی تھی نہ اس کا کوئی بیٹا ہے، نہ کوئی شریک، نہ کوئی ولی مددگار ہے۔ بیٹا اس کو بکار ہے جس نے مرجانا ہو، شریک اسے بکار ہے جو خود سارا کام نہ کر سکے اور مددگار اسے بکار ہے جو اپنی طاقت سے ایک کام کو نہیں کر سکتا بلکہ دوسرے کا محتاج ہے۔ اور عقیدہ ولد کا ذکر کر کے مضمون کا انتقال عیسائی مذہب کی طرف کیا جس پر اگلی سورت میں بحث ہے۔ نتیجہ سب کا ایک ہے کہ دلوں پر عظمت صرف اللہ تعالیٰ کی ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرنا ہی رسولوں کی بعثت کی اصل غرض ہے۔ عیسائیت کے ذکر سے پہلے اللہ تعالیٰ کی بڑائی کا ذکر بھی خاص معنی رکھتا ہے۔

سورۃ الکہف

نام:

اس سورت کا نام الکہف ہے اور اس میں 12 رکوع اور 110 آیتیں ہیں اور کہف کے معنی غار بھی ہیں اور جائے پناہ بھی۔ اور اس سورت کا نام کہف اس وجہ سے ہے کہ اس میں اصحاب الکہف کا ذکر ہے یعنی چند لوگوں کا جنہوں نے شرک سے بچنے کے لیے اور توحید کو پھیلانے کے لیے ایک غار میں پناہ لی تھی۔ اور یہ لوگ عیسائی مذہب کے تھے اور عیسائی مذہب کی پرورش اس رنگ میں بھی کہف میں ہوئی کہ ایک عرصہ دراز تک اس کی حالت مظلومیت کی رہی اور آزادانہ اس کی تبلیغ نہ ہوسکتی تھی۔ اور اس رنگ میں بھی کہ اس میں جو اچھے لوگ ہوئے ہیں وہ زیادہ تر رہبانیت کی طرف جھکے رہے۔ یعنی دنیا و مافیہا سے الگ ہوکر پہاڑوں اور غاروں میں خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے۔ اور چونکہ اس سورت میں صرف ایک ہی ذکر ہے یعنی عیسائی مذہب کا اس لیے اس کا نام کہف اسی مذہب کی تاریخ کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ہے۔

خلاصہ مضمون:

اس سورت کے ربط مضامین میں بہت سی مشکلات کا سامنا ہے اور بظاہر اس میں تین موٹے موٹے ذکر الگ الگ نظر آتے ہیں یعنی ذکر اصحاب کہف، ذکر خضر و موسیٰ، ذکر ذوالقرنین جن کا بظاہر ایک دوسرے سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ مفسرین نے آسان توجیہ یوں کردی ہے کہ چونکہ یہود نے تین سوال اکٹھے کیے تھے یعنی روح کے متعلق، اصحاب کہف کے متعلق اور ذوالقرنین کے متعلق۔ اس لیے ایک کا جواب پچھلی سورت میں دے دیا اور دو کا یہاں۔ مگر اول تو جب دو سورتوں میں الگ الگ جواب کر دیئے تو اس بنا پر ان کا اکٹھا ایک سورت میں لانا بے معنی ہے۔ علاوہ بریں خضر و موسیٰ علیہما السلام کا ذکر دونوں کے درمیان کیوں رکھا۔ اصل بات یہ ہے کہ جو مفہوم ان تینوں کے نیچے ہے وہ ایک ہے اور باوجود تین الگ الگ زمانوں کے، الگ الگ ملکوں کے، الگ الگ اشخاص کے واقعات ہونے کے تینوں کا تعلق ایک نہ ایک رنگ میں عیسائی مذہب سے اور نبی کریم ﷺ کی تبلیغ حقہ سے ہے۔ سورت کی ابتدا قرآن کے کتاب قیم ہونے اور ان لوگوں کے انذار سے کی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف بیٹا منسوب کرتے ہیں۔ پھر ان لوگوں کی زمینی آرائشوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہی وہ دجالی فتنہ ہے جس کا ذکر احادیث نبوی میں ہے۔ اس لیے کہ انہی فتنوں کے علاج کے طور پر ان آیات کے پڑھنے کا حکم ہے اور اس فتنہ دجالی کے ساتھ جو بالآخر عیسائی مذہب کی تعلیم اور عیسائی اقوام کی دنیوی حالت سے پیدا ہونا تھا۔ عیسائی مذہب کی ابتدا کا ذکر اصحاب کہف کے تذکرہ میں کیا ہے۔

① یوں پہلے رکوع میں فتنہ دجالی کے ذکر کو اصحاب کہف کے ذکر کے ساتھ ملایا ہے۔

② دوسرے رکوع میں ان اصحاب کہف کی حقیقت کو بیان کیا ہے اور

③ تیسرے میں ان کے خاتمہ کا ذکر کیا ہے اور چونکہ عیسائی اقوام اسلام کے پیغام حقہ کو قبول کرنے میں تمام دنیا کی اقوام سے پیچھے رہ گئی ہیں اس لیے

④ چوتھے رکوع میں دعوت الی الحق اور اس کی مشکلات کا ذکر کیا۔

⑤ پانچویں میں عیسائیت اور اسلام کا ایک تمثیل کے رنگ میں ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ عیسائیت کو اپنے مال و دولت اور حکومت پر فخر ہوگا اور اسلام کو خدائے واحد کی پرستش کی تعلیم دینے پر فخر ہے۔

⑥ اسی بنا پر چھٹے رکوع میں بتایا کہ دنیا کا مال و دولت محاسبہ اعمال میں ہیچ اشیاء ہیں۔

⑦ ساتویں میں شیطان کی دوستی کا انجام بتایا اور سمجھایا کہ جن تعلقات کی خاطر انسان حق کو چھوڑتا ہے یہ بھی آخر کار کسی کام نہیں آتے بلکہ انسان کی ہلاکت کا موجب ہوتے ہیں۔

⑧ آٹھویں میں اس دنیا کی مالک قوموں کو سمجھایا کہ کوئی قوم نہیں جو ہمیشہ علو کے مقام پر رہی ہو بلکہ ہر ایک کے لیے ایک ہلاکت کا وقت ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کے لیے بھی ہوگا۔ یعنی ان کی یہ قوت جس کی بنا پر پیغام حق کے قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں بالآخر توڑ دی جائے گی۔

⑨,⑩ نویں اور دسویں رکوع میں حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے واقعات کو بیان کر کے سمجھایا ہے کہ خدا کا پیغام بنی اسرائیل تک محدود نہ تھا بلکہ سلسلہ اسرائیل کا عظیم الشان بانی یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی صرف ایک ہی قوم کے لیے ہدایت لے کر آئے تھے اور انہی کے زمانہ میں ان کے سامنے ایسے لوگ موجود تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے دوسری اقوام کے لیے پیغامبر بنایا تھا۔ اور جو علم خضر رکھتے تھے وہ موسیٰ کو نہ تھا اور جو موسیٰ کو علم دیا گیا وہ خضر کو نہ تھا۔ ان واقعات میں یہ سمجھانا مقصود ہے کہ سلسلہ اسرائیل جو خود مختص القوم تھا اس میں کل دنیا کا نجات دہندہ کس طرح آ سکتا تھا۔ اور دوسری طرف یہ بھی اشارہ کے رنگ میں بتایا کہ خود تمہاری کتابوں میں وہ پیشگوئیاں موجود ہیں جن سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت ظاہر ہوتی ہے۔

⑪ گیارہویں رکوع میں ایک ایرانی نبی یا مصلح کا ذکر کیا جس کا نام ذوالقرنین ہے۔ اور اس میں بھی یہی سمجھانا مقصود ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ ہر قوم کو الگ الگ نبوتیں دیتا رہا۔ اور ساتھ ہی اس ذوالقرنین کو یاجوج ماجوج سے مقابلہ پیش آیا جن کی روک تھام کے لیے اس نے ایک عظیم الشان دیوار بنائی۔ اور یاجوج ماجوج کا ہی فساد بالآخر دوبارہ ظاہر ہونے والا تھا۔ جب اسلام کو ظاہری طور پر یعنی ملکی رنگ میں بہت مغلوبیت کا پہلو دیکھنا پڑے گا، مگر آخر کار اسلام ہی غالب آئے گا۔ اور یاجوج ماجوج جو زبردست عیسائی اقوام کے لیے ہی دوسرا نام ہے بالآخر اسلام کے سامنے گردن جھکائیں گے۔

⑫ اس کے بعد آخری رکوع میں عیسائی اقوام کی آخری حالت کا نقشہ کھینچا۔ عقیدتاً انسان کو خدا بنانے والے عملاً دنیا اور اس کی صنعتوں میں منہمک معلوم کرلیں گے کہ نجات بغیر اسلام کے نہیں اور کہ مسیح خدا کی مخلوق میں سے ایک مخلوق ہے اور کہ محمد رسول

اللہ ﷺ نسل انسانی کو اعلیٰ سے اعلیٰ مقامات کی طرف بلاتے ہیں۔

تعلق:

اس سورت کا تعلق بنی اسرائیل کے ساتھ نہایت صاف ہے۔ پچھلی سورت کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا تھا ﴿وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا﴾ [بنی اسرائیل: 111:17] اور اس کی ابتدا ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ﴾ سے کر کے شروع میں ہی ﴿وَّ یُنْذِرَ الَّذِیْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا﴾ [4] کا ارشاد فرمایا اور بلحاظ مضمون سورت دیکھا جائے تو بھی تعلق نہایت صاف ہے۔ پچھلی سورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کی تاریخ بنی اسرائیل کا کچھ ذکر تھا اور اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کی تاریخ کا کچھ ذکر ہے۔ یعنی عیسائی مذہب کی تاریخ کا۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آخری خلیفہ ہیں۔ لیکن اگر یہود کے ذکر کو نہایت مختصر کیا تھا ﴿لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ﴾ [بنی اسرائیل: 4:17] ''ضرور تم ملک میں دو دفعہ فساد کرو گے۔'' تو عیسائیت کی تاریخ کو کہف کی حالت سے شروع کر کے ﴿یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا﴾ [104] تک بیان کیا۔ یعنی ایک طرف ان کی رہبانیت اور ترک دنیا اور دوسری طرف حد درجہ کی دنیا پرستی اور خدا کا نام تک ترک کر دینا اور عالم الغیب خدا کے کلام میں ایسا ہی ہونا چاہیے تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہود اس قوت و اقتدار کو حاصل نہیں کریں گے جسے عیسائی حاصل کریں گے۔ ایک لطیف تعلق یہ بھی ہے کہ سورہ بنی اسرائیل میں اسری کے ذکر میں آنحضرت ﷺ کی ہجرت کی طرف اشارہ تھا اور یہاں اس ہجرت میں کہف یعنی جائے امن ملنے کی خوشخبری دی۔

زمانۂ نزول:

اس سورت کا وہی ہے جو سورہ بنی اسرائیل کا یعنی قریباً پانچواں سال بعثت کا یا اس سے بھی پیشتر۔ اور یہ ان سورتوں میں سے ایک سورت ہے جو جملۃً واحدۃً نازل ہوئی ہیں یعنی ساری سورت ایک ہی وقت میں نازل ہوئی۔ اور اس کی بنا ایک حدیث ہے (ر) اور یہ ساری سورت مکی ہے۔

اٰیَاتُهَا 110 (18) سُوْرَةُ الْكَهْفِ مَكِّيَّةٌ (69) رُكُوْعَاتُهَا 12

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَ لَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ○ — سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری اور ان کے لیے کوئی کجی نہ رہنے دی۔ (1891)

1891- ﴿وَ لَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس جملہ کو معترضہ قرار دیا ہے تو کہا ترکیب یوں ہوئی [اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ قَيِّمًا] (ج) اور ﴿لَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا﴾ کے معنی کے گئے ہیں کہ اس میں کوئی میل عن الحق یا التباس نہیں۔ (ج) یا اس میں کوئی اختلال لفظی یا تناقص معنی نہیں (ر) مگر دوسری جگہ ہے ﴿قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا﴾ [آل عمران: 99:3] ''کہہ اے اہل کتاب کیوں اسے اللہ کی راہ سے روکتے ہو جو ایمان لائے تم اس کے لیے ٹیڑھا پن چاہتے ہو۔'' اور ﴿الَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ یَبْغُوْنَهَا عِوَجًا﴾ [الأعراف: 45:7] یعنی حق کے دشمن لوگوں کو اس سے روک کر سیدھی راہ کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ یہاں اسی طرف اشارہ ہو کہ اس کتاب کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کامل بندہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قیم ہونے کی حالت میں اتارا ہے۔ اس لیے جو لوگ اس سے روک کر یا وساوس ڈال کر اس میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہوسکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایسی کجیوں کو دور کر دیا ہے اور باقی نہیں رہنے دیا۔ اور چونکہ اس سورت میں خطاب عیسائیوں سے ہے جو ﴿یَبْغُوْنَهَا عِوَجًا﴾ کے اصل مصداق بھی ہیں اس لیے یہ معنی زیادہ موزوں ہیں اور اسی صورت میں اس کا جملہ معترضہ ہونا بھی موزوں ٹھہرتا ہے۔ کیونکہ کتاب کا اتارنا ہی بے معنی ہوتا اگر مخالف اس سے روک کر اس میں عوج پیدا کر سکتے اور عوج پیدا کرنا یہی ہے کہ اس غرض کو جس کے لیے کتاب اتاری گئی ہے پورا نہ ہونے دیا جائے۔

اس سورت کو حمد کے ساتھ شروع کیا ہے اور حمد ربوبیت سے ہے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○﴾ پس مراد یہ ہے کہ کتاب کا اتارنا انسانوں کی ربوبیت کے لیے ہے اور اس میں بالخصوص ربوبیت روحانی کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ قیم سے بھی ظاہر ہے۔ کیونکہ اسی سے کمال انسانی حاصل ہوتا ہے۔ اور اس سورت کی ابتدا ربوبیت روحانی کے ذکر سے اس لیے کی کہ اس میں اس قوم کا ذکر ہے جو بالکل دنیا کی زندگی پر گر گئی ﴿اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا﴾ [104] یعنی عیسائی قوم۔

فتنہ دجال سے مراد فتنہ عیسائیت ہے:

حدیث صحیح میں ہے جسے مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور امام احمد نے روایت کیا ہے [أَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: "مَنْ حَفِظَ عَشْرَ آيَاتٍ مِنْ أَوَّلِ سُورَةِ الْكَهْفِ عُصِمَ مِنَ الدَّجَّالِ".] (صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين، باب فَضْلِ

قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَأْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَ — قائم رکھنے والی، تاکہ اس کی طرف سے سخت عذاب سے
يُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ — ڈرائے اور ان مومنوں کو خوش خبری دے جو اچھے عمل

سُورَةِ الْكَهْفِ وَآيَةِ الْكُرْسِيِّ، حديث: 1919) یعنی نبی ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص سورت کہف کی ابتدائی دس آیتیں یاد رکھے گا وہ دجال سے محفوظ رہے گا۔ اور دوسری حدیث میں جو اسے بھی مسلم اور نسائی اور احمد نے روایت کیا ہے یہ لفظ ہیں [قَالَ: "مَنْ قَرَأَ عَشْرَ آيَاتٍ مِنْ آخِرِ الْكَهْفِ، عُصِمَ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ".] (مسند أحمد، جلد45، صفحہ 508) یعنی جو شخص سورہ کہف کی پچھلی دس آیات پڑھے گا وہ فتنہ دجال سے محفوظ رہے گا۔ اور احمد کی ایک روایت میں ان دونوں کو یوں جمع کیا ہے کہ جو شخص سورہ کہف کی پہلی اور پچھلی آیتوں کو پڑھے گا اس کے سر سے قدم تک نور ہو جائے گا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ قرآن شریف ایک پُرحکمت علمی کتاب ہے اور تعویذوں، منتروں کی طرح اپنے آپ کو پیش نہیں کرتا کہ فلاں لفظ کے پڑھ لینے سے فلاں مشکل حل ہو جاتی ہے۔ پس یہ غور طلب ہے کہ ان پہلی اور پچھلی دس آیتوں میں کیا خاص بات ہے جو فتنہ دجال سے بچا سکتی ہے۔ ایک سرسری نظر سے معلوم ہو جاتا ہے کہ دونوں جگہ عیسائیت کا ذکر ہے۔ پہلی دس آیات میں ﴿قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا﴾ میں بلحاظ عقیدہ کہ وہ خدا کا بیٹا بناتے ہیں اور ﴿اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً﴾ میں بلحاظ عمل یعنی زمین کو زینت دیں گے اور پچھلی دس میں ﴿اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ﴾ میں بلحاظ عقیدہ اور ﴿اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا﴾ [104] میں بلحاظ عمل کہ ان کی ساری کوشش دنیا پر اور صنعتوں پر صرف ہوگی۔ تو جب ان کے عقائد اور اعمال کی طرف توجہ دلا دی اور یہ بھی بتا دیا کہ ان کی دنیوی ترقیوں کی ظاہری دلفریبیوں پر نہ جانا۔ تو ان کے فتنہ سے بچنے کی راہ بتا دی اور ایک مسلمان پر جو قرآن کے خدا کا کلام ہونے پر ایمان لاتا ہے آج تیرہ سو برس بعد ان نظاروں کو دیکھ کر جو قرآن شریف میں پہلے سے بتائے ہوئے موجود ہیں خدا کے کلام پر اور ایمان بڑھتا ہے اور یوں وہ عیسائیوں کے عظیم الشان فتنہ سے بچتا ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دجال کا فتنہ یہی عیسائیت کا فتنہ ہے اور قرآن شریف اپنی صراحت سے اس پر شاہد ہے۔ حدیثوں میں تو دجال کی تعیین میں بہت سے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض حدیثوں میں ابن صیاد پر جزم معلوم ہوتا ہے حالانکہ وہ مسلمان ہو کر مرا۔ مگر قرآن شریف میں ایسی پکی بات ہے جس پر کسی کو اعتراض کی گنجائش ہی نہیں۔

احادیث میں لفظ دجال اختیار کرنے کی وجہ اور لفظ کی لغوی تشریح:

اس جگہ لفظ دَجّال کی لغت دے دینا بھی خالی از فائدہ نہ ہوگا تا معلوم ہو کہ کیوں احادیث میں عیسائیت کی جگہ [مَسِيْحَ الدَّجَّالِ] کا لفظ اختیار کیا گیا ہے۔ [دَجَلُ الشَّيْءُ] کے اصل معنی ہیں غَطَّاهُ یعنی اسے ڈھانک دیا اور دَجّال کے مختلف معنی اس لحاظ سے ہیں کہ ڈھانکنا کیسا ہے۔ چنانچہ اس کے پہلے معنی كَذَّابٌ ہیں۔ اس لیے کہ جھوٹ سے بھی ایک پردہ ڈال دیا جاتا ہے اور ابن سیدہ کہتے ہیں دجال کا نام دجال اس لیے رکھا گیا کہ وہ حق کو باطل کے ساتھ ڈھانک دے گا۔ اور کہا گیا ہے

الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَہُمۡ اَجۡرًا حَسَنًا ۙ﴿۲﴾ کرتے ہیں کہ ان کے لیے اچھا اجر ہے۔(1892)

مّٰکِثِیۡنَ فِیۡہِ اَبَدًا ۙ﴿۳﴾ وہ اس میں ہمیشہ ٹھہرنے والے ہیں۔

بلکہ اس لیے کہ وہ اپنی جماعتوں کی کثرت سے زمین کو ڈھانک لے گا اور بعض نے کہا اس لیے کہ وہ لوگوں پر اپنے کفر کا پردہ ڈال دے گا اور حدیث میں ہے [يَكُونُ فِي آخِرِ الزَّمَانِ دَجَّالُونَ] (صحيح مسلم، كتاب المقدمة، باب النَّهْيِ عَنِ الرِّوَايَةِ عَنِ الضُّعَفَاءِ وَالاِحْتِيَاطِ فِي تَحَمُّلِهَا، حديث: 16) یعنی آخری زمانہ میں دجال ظاہر ہوں گے اور ایک میں ہے کہ قیامت سے پہلے دجال ہوں گے اور ازہری نے کہا کہ ہر کَذَّابٌ دجال ہے اور دَجَّال کے ایک معنی ہیں بڑا گروہ جو اپنی کثرت کی وجہ سے ساری زمین پر پھیل جائے اور بعض کے نزدیک ایسا گروہ جو اپنا سامان تجارت کے لیے اٹھائے پھرے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ دجال کو دجال اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ جو کچھ دل میں رکھتا ہے اس کے خلاف ظاہر کرتا ہے۔ (ل) اب اس تمام تشریح سے جو لسان العرب سے نقل کی گئی ہے کس قدر صفائی سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے جو عیسائیت کے فتنہ کو فتنہ دجال قرار دیا ہے تو یہ بالکل صحیح ہے۔ اور آج واقعات نے کس دل کو اس بات کا قائل نہیں کر دیا کہ اس کے سوا دوسرے دجال کا تلاش کرنا صریح غلطی ہے۔ حدیث کے استعارات کو حقیقت پر محمول کرنے سے یہ غلطی پیدا ہوئی ہے اور [مَسِيْحَ الدَّجَّالِ] کا لفظ اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ مسیح کی اصل تعلیم کے بالکل خلاف وہ تعلیم ہے جو عیسائیت اس وقت دنیا میں پھیلا رہی ہے۔

1892 - ﴿قَیِّمًا﴾۔ قِیَامٌ کے معنی کسی چیز کی نگہداشت اور حفاظت کرنا ہیں۔ اور یہاں کتاب کو قَیِّمٌ کہا ہے (جو مبالغہ کا صیغہ ہے) اور دوسری جگہ دین کو قَیِّم کہا ہے ﴿ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ﴾ [التوبة: 36:9] ''یہ دین مضبوط ہے۔'' اور ایک جگہ ہے ﴿ذٰلِکَ دِیۡنُ الۡقَیِّمَۃِ﴾ [البينة: 5:98] ''یہی دین ٹھیک ہے۔'' اور دین کے قیم ہونے سے مراد ہے مضبوط اور معاش اور معاد کے امور کو قائم رکھنے والا اور ﴿فِیۡہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ﴾ [البينة: 3:98] ''جس میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں۔'' میں اشارہ اللہ تعالیٰ کی کتابوں کے معانی کی طرف ہے جو قرآن میں موجود ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی پہلی ساری کتابوں کے ثمرات قرآن میں جمع ہیں اور اللہ تعالیٰ کو قیوم کہا ہے۔ یعنی سب چیزوں کی حفاظت کرنے والا اور ان کے قیام کے سامان عطا کرنے والا۔ (غ) اور فراء کا قول ہے کہ وہ ساری کتب سماوی پر قیم ہے یعنی ان کی حفاظت کرنے والی۔ اور ابو مسلم کہتے ہیں مصالح عباد کو قائم کرنے والی اور ان کی متکفل اور بعض نے کہا اپنی ذات میں کامل، دوسرے کو کامل کرنے والی۔ (ر) اور حقیقت میں وہ دونوں رنگ میں قیم ہے یعنی کتب سماوی کی صحیح تعلیم کی حفاظت بھی اس نے کی جیسا کہ دوسری جگہ اسے ﴿مُہَیۡمِنًا عَلَیۡہِ﴾ [المآئدة: 48:5] ''اس پر نگہبان۔'' کہا ہے اور وہ انسان کو اپنے کمال کو پہنچانے والی بھی ہے اور تعلیم کو بھی۔ اور اس کی تعلیم کے کمال سے اس کا پیرو بھی اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔

دو باتیں بیان کی ہیں۔ ایک سخت عذاب کا انذار۔ یہ ان کے لیے ہے جو ﴿یَبۡغُوۡنَہَا عِوَجًا﴾ کے مصداق ہیں اور دوسرا اجر حسن اور یہ ان کے لیے ہے جو اس کے پیچھے چل کر اپنے کمال کو حاصل کرتے ہیں۔ اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوتیں تو اس کے کمال

وَّ یُنْذِرَ الَّذِیْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝۴

اور انہیں ڈرائے جو کہتے ہیں اللہ نے بیٹا بنالیا۔ (1893)

مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّ لَا لِاٰبَآىِٕهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝۵

انہیں اس کے متعلق کچھ بھی علم نہیں اور نہ ان کے بڑوں کو (تھا) بڑی بات ہے جو ان کے مونہوں سے نکلتی ہے۔ وہ جھوٹ ہی کہتے ہیں۔ (1894)

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا ۝۶

تو کیا تو اپنی جان کو ان کے پیچھے غم سے ہلاک کر دے گا اگر وہ اس بات پر ایمان نہ لائیں۔ (1895)

میں نقص ہوتا۔

1893 - **عیسائی اقوام کی مخالفت اسلام:** حالانکہ پہلے بھی انذار کا ذکر کیا ہے مگر یہاں پھر دہرایا اور یہاں انذار کو اس قوم سے خاص کیا جو اللہ تعالیٰ کی طرف بیٹا بنانا منسوب کرتے ہیں یعنی عیسائی۔ اور یہ گویا عطف خاص علی العام ہے یعنی پہلے تو تمام ان مخالفین کا ذکر تھا جو ﴿یَبْغُوْنَهَا عِوَجًا﴾ کے مصداق ہیں۔ اور اب ایک خاص قوم کا ذکر کیا جو سب سے بڑھ کر قرآن شریف کے پھیلنے میں روک ہونے والی تھی اور اس خاص ذکر میں یہی اشارہ ہے کہ سب مخالفتوں سے بڑھ کر ان کی طرف سے اسلام کی مخالفت ہوگی۔ یہ خیال کہ اس سے مراد مشرکین عرب ہیں بالکل غلط ہے۔ اس لیے کہ آگے صاف ذکر اصحاب کہف کا ہے جو عیسائی تھے۔

1894 - ﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً﴾ نصب علی التمییز ہے گویا فرمایا کہ جو بات یہ کہتے ہیں وہ کتنی بڑی بات ہے۔

عیسائیت کے اصل الاصول پر کوئی علمی یا عقلی دلائل نہیں:

عیسائی عقیدہ ابنیت والوہیت مسیح پر اس سے بڑھ کر کوئی زد نہیں ہوسکتی تھی جو قرآن شریف نے یہاں فرمایا یعنی اس عقیدہ اتخاذ ولد کا نہ انہیں علم حاصل ہے یعنی نہ ان کے پاس کوئی علمی دلائل ہیں، نہ ان کے باپ دادوں کے پاس تھیں۔ جس چیز کے لیے کوئی علمی اور عقلی دلائل پیش کی جائیں اس کی تردید دلائل سے کی جاسکتی ہے مگر عیسائیت نے اپنے عقیدہ کو خود بھی اس قدر عقل اور علم سے دور سمجھا ہے کہ اس مذہب کے مشنری سے جب ابنیت کفارہ وغیرہ کے عقلی دلائل پوچھو تو یہ جواب ملے گا کہ اسے مان لو پھر اس کی صداقت معلوم ہوجائے گی۔ اور یہ صاف الفاظ میں اس بات کا اعتراف ہے کہ اس کے لیے کوئی علمی یا عقلی دلائل موجود نہیں۔ اور نہ صرف ان کے پاس نہیں بلکہ جب سے یہ عقیدہ ایجاد ہوا کبھی اس پر کوئی علمی دلائل پیش نہیں کی گئیں۔

1895 - ﴿بَاخِعٌ﴾۔ بَخْعٌ کے معنی ہیں غم کے ساتھ اپنے آپ کو ہلاک کر دینا۔ (غ) ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا یَكُوْنُوْا

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝

جو کچھ زمین پر ہے ہم نے اسے اس کے لیے زینت بنایا تاکہ انہیں آزمائیں کہ کون کون ان میں سے بہترین عمل کرنے والا ہے۔

وَ اِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ۝

اور ہم یقیناً اسے جو اس پر ہے خالی زمین چٹیل میدان بنادیں گے۔(1896)

مُؤْمِنِيْنَ ۝﴾[الشعرآء: 3:26] ''شاید تو اپنی جان کو ہلاک کردے گا کہ یہ ایمان نہیں لاتے۔''

﴿عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ﴾ کے لفظی معنی ہوں گے ان کے پیچھے۔ اور مراد ہے ان کے ایمان سے پھر جانے کے بعد۔

جب خدا کا بیٹا ماننے والی قوم کا ذکر کیا تو ساتھ ہی ان کے اس کفر پر اصرار کا بھی ذکر کیا۔ آج تیرہ سو سال سے اسلام ان کے سامنے ہے مگر سوائے تھوڑوں کے انہوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ نہ صرف اس آیت سے بلکہ اس سے اگلی آیات سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو ان کی دنیوی زیب و زینت کا اور اسلام سے اعراض کا نقشہ دکھایا گیا ہے اور اس کا ثبوت احادیث صحیحہ سے بھی ملتا ہے جہاں نزول عیسیٰ کی ضرورت یہ بتائی کہ وہ کسر صلیب کرے گا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صلیبی غلبہ آپ کو دکھایا گیا تھا۔ اور آپ کے قلب کو اس سے اتنا رنج پہنچتا تھا کہ فرمایا تو اس رنج میں اپنے آپ کو ہلاک کردے گا۔ نبی کریم ﷺ کے سینہ میں جو درد نسل انسانی کے لیے تھا اس کی تہہ کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسی فکر میں گزرتا تھا کہ کس طرح انسان اپنے مولیٰ کے حضور سر جھکائے۔ پس جس طرح اس قوم کی وجہ سے جو آپ کے سامنے کفر پر اصرار کر رہی تھی آپ کو رنج و غم تھا اسی طرح ان قوموں کے لیے بھی تھا جو بعد میں آنے والی تھیں۔ اور آپ نسل انسانی کے لیے اسی غم میں گھل رہے تھے۔ مگر جس طرح اس غم نے پہلے اپنا اثر دکھایا اور وہ قوم مسلمان ہوگئی اسی طرح ضرور ہے کہ آنحضرت ﷺ کا یہ درد اب بھی اپنا رنگ لائے۔

1896 - جُرُزٌ۔ جَرَزٌ کے معنی ہیں جلدی سے کھا جانا اور جَرُوْزٌ بہت کھانے والے کو کہتے ہیں جو دسترخوان پر کچھ باقی نہ چھوڑے اور اَرْضٌ جُرُزٌ سے مراد وہ زمین ہے جس میں سبزی نہ اُگے، گویا کہ وہ نبات کو کھا گئی ﴿اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ﴾ [السجدۃ: 27:32] ''ہم پانی کو سبزی سے خالی زمین کی طرف چلا رہے ہیں۔'' (ل)

عیسائی اقوام کی زمینی ترقی اور ایک پیشگوئی:

اس سے پہلی آیت میں بتایا تھا کہ زمین پر جو سامان ہیں وہ موجب زینت بنادیئے جائیں گے اور عیسائی اقوام نے اس میں فی الواقع کمال حاصل کیا ہے کہ جہاں ان کا تصرف ہوتا ہے وہاں وہ دنیوی زیب و زینت کے سامانوں کو کمال تک پہنچا دیتے

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝۹

کیا تو سمجھتا ہے کہ غار اور کتبہ والے ہماری عجیب نشانیوں میں سے تھے۔ (1897)

ہیں۔ گویا اشارۃً بتایا کہ حق سے اعراض کی وجہ یہی ہے کہ دنیا کی زیب وزینت میں منہمک ہو جائیں گے۔ گو چاہیے یوں تھا کہ زمینی آرائش کے ساتھ اخلاق کی آرائش کی طرف توجہ کرتے اور سمجھتے کہ انسان کی اصل زینت دنیوی سامانوں سے نہیں بلکہ اخلاق سے ہے۔ ﴿اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ میں یہی اشارہ ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اسی خوبصورت اور آراستہ زمین کو ہم ایسی مٹی بنا دیں گے جس پر کوئی سبزی نہیں اگتی۔ یعنی یہ ان کے دنیا کی زیب وزینت کے سامان برباد کر دیئے جائیں گے اور مراد یہ ہے کہ ان کی دنیوی ترقی جس پر ان کو فخر ہے اور جس کی وجہ سے وہ اسلام سے رکے ہوئے ہیں ان کے کام نہ آئے گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر یہ قوم حق کی طرف رجوع کرے گی۔ اور عام طور پر یہ بھی صحیح ہے کہ جب کبھی کوئی قوم عروج دنیوی کی انتہا پر پہنچی ہے تو اس کے بعد زوال بھی دیکھا ہے اور قوموں کے بارہ میں یہ اللہ تعالیٰ کا عام قانون ہے جس سے دنیا کی کوئی قوم نہ پہلے مستثنیٰ ہوئی نہ آئندہ ہوگی۔ موجودہ تہذیب اور اس کے تعیش کے سامانوں کا بھی آخر وہی حشر ہوگا جو پہلے ہوتا رہا۔

1897 - ﴿اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ﴾ کہف غار کو کہتے ہیں اور [فُلَانٌ كَهْفُ فُلَانٍ] کے معنی ہیں وہ اس کی جائے پناہ ہے۔ (ل)

رَقِيْمِ۔ رَقْمٌ سے ہے جس کے معنی ہیں موٹا لکھنا یا واضح طور پر لکھنا۔ (غ) اور رقیم لکھی ہوئی چیز ہے فعیل بمعنی مفعول اور اس میں اختلاف ہے کہ رقیم سے یہاں کیا مراد ہے۔ ایک قول ہے کہ وہ اس جگہ کا نام ہے اور دوسرا یہ کہ وہ کتبہ ہے جس میں ان کے نام لکھے ہوئے تھے اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک قول منقول ہے کہ میں نہیں جانتا کہ اَلرَّقِيْمُ کیا ہے۔ (ل) اور ایک حدیث میں ہے [كَانَ يَزِيْدُ فِي الرَّقْمِ] جہاں رَقْمٌ سے مراد کپڑوں پر قیمتوں کا لکھنا ہے۔ (ل) اور ابن جریر مختلف اقوال کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ صحیح تر قول یہ ہے کہ رقیم سے مراد تختی یا پتھر یا کوئی چیز ہے جس پر کچھ لکھا ہوا ہو۔ (ج)

عیسائیوں کے انکار صداقت اسلامی اور ان کے دنیوی زیغوں کے سامانوں میں فوراً اصحاب کہف کا ذکر شروع ہو جاتا ہے۔ اور یہ تعلق ہی اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ یہ مضمون عیسائیت سے تعلق رکھتا ہے۔ اصحاب کہف کا مشہور قصہ خود اسی بنا پر ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مذہب پر تھے اور شہنشاہ ڈیسئس یا دقیانوس کے زمانہ کے چند نوجوان تھے جنہوں نے اس بادشاہ کی ایذا رسانی سے تنگ آ کر ایک غار میں پناہ لی جہاں اطلاع ملنے پر بادشاہ نے غار کے سامنے دیوار بنوا دی اور اختلاف روایات پر کوئی دو سو سال سے لے کر پونے چار سو سال تک یہ لوگ اس غار میں سوئے رہے، تب وہ جاگے اور اس وقت رومن امپائر میں عیسائی مذہب کا دور دورہ تھا۔ اس لیے ان کی اطلاع ملنے پر اس وقت کا بادشاہ خود انہیں دیکھنے گیا۔ اور بعض روایات کے مطابق اس نے انہیں دیکھا اور بعض کے مطابق ان کا پتہ نہ ملا۔

اِذْ اَوَی الْفِتْیَۃُ اِلَی الْکَھْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ جب اِن نوجوانوں نے غار میں پناہ لی تو کہا اے ہمارے

اصحاب کہف کے ذکر سے قرآن کریم کی اصل غرض:

فی الواقع کوئی ایسے لوگ تھے یا نہیں۔ بظاہر اس قصہ کی عام شہرت بتاتی ہے کہ ان روایات میں گو کچھ خلط ملط ہو گیا ہے مگر کچھ نہ کچھ اصل اس کی ضرور تھی۔ لیکن قرآن شریف کے ظاہر الفاظ بتاتے ہیں کہ غار کا منہ بند ہو جانے پر ان لوگوں کا اندر سو یا رہنا صحیح نہیں جیسا کہ [آیت:17] کے مضمون سے ظاہر ہے۔ پس جس رنگ میں یہ مشہور ہے اس رنگ میں قرآن شریف نے اسے قبول نہیں کیا اور ابتدا میں ہی انہیں بجائے اصحاب کہف کے ﴿اَصْحٰبَ الْکَھْفِ وَالرَّقِیْمِ﴾ کے نام سے یاد کیا ہے۔ ﴿اَصْحٰبَ الْکَھْفِ﴾ تو وہ لوگ ہوں گے جو غار میں رہے مگر اَصْحٰبَ الرَّقِیْمِ سے کیا مراد ہے۔ اس میں مفسرین کا بھی بہت کچھ باہم اختلاف ہے۔ رقیم کے معنی جو اوپر بیان ہوئے ہیں ان سے ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا امتیازی نشان جس طرح پر غار ہے اسی طرح ایسی تختیاں بھی ان کا امتیازی نشان ہے جن پر کچھ لکھا ہوا ہو۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ ایک تختی پر ان کا قصہ یا ان کے نام لکھے ہوئے تھے اسی لحاظ سے انہیں اَصْحٰبَ الرَّقِیْمِ کہا گیا ہے۔ لیکن ایسی کوئی تختی آج موجود نہیں۔ علاوہ ازیں قرآن کریم میں جو قصص مذکور ہیں تو ان کی غرض صرف اسی قدر نہیں ہوتی کہ ایک پرانے قصے کو دہرایا جائے بلکہ آئندہ واقعات پر بھی کچھ روشنی ڈالنا مقصود ہوتا ہے۔ اسی لحاظ سے دیکھا جائے تو ﴿اَصْحٰبَ الْکَھْفِ وَالرَّقِیْمِ﴾ کے قصہ میں عیسائیت کی تاریخ بتائی گئی ہے۔ اصحاب کہف کون تھے اور ان سے کیا معاملہ ہوا اس کے جاننے کی ہمیں اتنی ضرورت نہیں جتنی اس بات کے جاننے کی ضرورت ہے کہ وہ مذہب جس کا مقابلہ سب سے بڑھ کر اسلام سے ہونے والا تھا اس کے متعلق قرآن شریف نے کیا فرمایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف نے صرف ﴿اَصْحٰبَ الْکَھْفِ﴾ کا نام اختیار کرنے کی بجائے ﴿اَصْحٰبَ الْکَھْفِ وَ الرَّقِیْمِ﴾ فرمایا ہے۔ کیونکہ عیسائیت کی تاریخ کا خلاصہ انہی دو الفاظ میں آ جاتا ہے یعنی کہف اور رقیم میں۔ عیسائیت کی ابتدائی تاریخ غار سے وابستہ ہے اور اس کی آخری حالت رقیم سے۔ عیسائیت کی پرورش غاروں میں ہوئی نہ صرف اس لیے کہ ابتدا میں اس مذہب کے قبول کرنے والوں کو مظالم سے تنگ آ کر غاروں میں پناہ لینی پڑی بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ عیسائیت کا پہلا رجحان رہبانیت کی طرف تھا اور اس لیے عیسائیوں میں جو بڑے بڑے لوگ ہوئے انہوں نے رہبانیت اختیار کر کے غاروں میں ہی اپنے کمال کو حاصل کیا اور دنیا کو بکلی ترک کر کے گوشہ گزینی اختیار کی، جس کی طرف لفظ کہف میں اشارہ ہے اور اس مذہب کی آخری حالت رقیم سے وابستہ ہے یعنی لکھی ہوئی تختیوں سے جو اس قوم کا نمایاں امتیاز ہے کہ نہ صرف ہر زندہ شخص کے نام کی تختی لکھی ہوتی ہے نہ صرف مردہ کی قبر پر لکھی ہوئی تختی ہوتی ہے بلکہ ان کی تمام تجارتی اشیاء پر بھی ایک لکھی ہوئی تختی ہوتی ہے۔ اور لفظ رقیم کے اختیار کرنے میں اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ رقم کے معنی کپڑوں پر قیمتوں کا لکھنا بھی ہیں۔ اور تجارتی اشیاء پر قیمتوں کے لکھنے میں اشارہ ان کی وسعت تجارت کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ یا ان کے تجارت یا دنیا میں انہماک کی طرف۔ گویا رقیم کہف کے مقابل پر ہے اور جس طرح کہف رہبانیت کو ظاہر کرتی ہے یعنی دین کی خاطر دنیا کو بکلی ترک کر دینا۔ اسی طرح رقیم تجارت کو ظاہر کرتی ہے یعنی دنیا کی خاطر دین کو بکلی ترک کر دینا اور تجارتی اغراض کے سامنے تمام قسم کی

اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّ هَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝۱۰

رب ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما اور ہمارے کام میں ہمارے لیے بھلائی مہیا کر دے۔(1898)

فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۝۱۱

سو ہم نے غار میں ان کے کانوں پر گنتی کے سال (پردہ) ڈال رکھا۔(1899)

اغراض کو قربان کر دینا۔ سورت کے آخر پر الفاظ ﴿اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝۱۰۴﴾[104] بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جن کی ابتدار ہبانیت تھی اس افراط کے مقام پر بھی پہنچیں گے کہ صرف دنیا کے طالب رہ جائیں گے۔

یہاں ﴿اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ﴾ کے ذکر میں فرمایا کہ تم انہیں ہماری عجیب نشانیوں میں سے سمجھتے ہو۔ اس میں بھی یہی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصحاب کہف اس قدر عجیب نشان نہ تھے جس قدر عجیب وہ اصل بات ہے جس کی طرف اس ذکر سے رہنمائی کرنا مقصود ہے۔ اسی سورت میں یاجوج ماجوج کا ذکر بھی جن کا خروج آخری زمانہ سے تعلق رکھتا ہے یہی بتاتا ہے کہ اصحاب کہف کے ذکر میں خود عیسائیت کا ذکر مقصود اصلی ہے۔

1898- ﴿فِتْيَةٌ﴾۔ فَتٰی کی جمع ہے[دیکھو نمبر: 639] اور فِتْيَانٌ بھی جمع آتی ہے ﴿وَ قَالَ لِفِتْيٰنِهِ﴾[یوسف: 62:12] ''اور اس نے اپنے نوکروں سے کہا۔''

اصحاب کہف کے غار میں پناہ لینے کی اصل غرض:

مختصر طور پر اصحاب کہف کا ذکر اس اور اس سے اگلی دو آیات میں کیا ہے اور اصل حقیقت صرف اسی قدر ہے کہ وہ چند نوجوان تھے جنہوں نے دین کی خاطر غار میں پناہ لی اور اس غار میں کئی سالوں تک وہ باہر کی خبروں سے بے خبر رہے۔ اور ان کی غرض وہاں جانے میں صرف اس قدر نہ تھی کہ وہ کسی ظالم کے مظالم سے بچ جائیں بلکہ ان کے دلوں میں اعلائے کلمۃ اللہ کا جوش تھا۔ اسی لیے جب وہ غار کی طرف جاتے ہیں تو دعا کرتے ہیں کہ اے مولیٰ تو اپنی جناب سے ہمیں رحمت عطا فرما اور ہمارے معاملہ میں رشد یعنی بھلائی یا کامیابی کی راہ پیدا کر دے اور دوسری جگہ فرمایا ﴿وَ يُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا﴾[16] یعنی کوئی نفع یا فائدہ کی بات مہیا کر دے اور تم زندگی کی اصل غرض کو پالو۔ فتنہ یا ظلم کے خوف سے محض کسی غار میں چھپ کر بیٹھ رہنا کوئی رُشد نہیں بلکہ حقیقی بھلائی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا نام پھیلانے کی توفیق دے اور یہی رشد نبی کریم ﷺ کو ملنے کا بھی ذکر ہے ﴿اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ۝۲۴﴾[24] [دیکھو نمبر: 1909]۔

1899- ﴿فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ﴾ مفعول محذوف ہے۔ [ضَرَبْنَا عَلٰى اٰذَانِهِمْ حِجَابًا] یعنی اُن کے کانوں پر پردہ ڈال دیا۔ (ر) مفسرین نے عموماً اس سے مراد نیند یعنی سلا دینا لیا ہے۔ مگر اصل مفہوم ان الفاظ کا صرف اس قدر ہے کہ اس عرصہ میں وہ دنیا

ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ﴿۱۲﴾ ع 1 12 13

پھر ہم نے انہیں بھیجا تا کہ ہم ظاہر کریں کہ دونوں گروہوں میں سے کون اس مدت کی بہتر حفاظت کرنے والا ہے جو ٹھہرے رہے۔ (1900)

کے واقعات سے بے خبر رہے۔

﴿سِنِیْنَ عَدَدًا﴾ سے مراد [سِنِیْنَ مَعْدُوْدَۃٌ] ہی ہے یعنی گنتی کے سال (ج) اور راغب کہتے ہیں کہ عدد سے مراد کبھی قلت کا ظاہر کرنا ہوتا ہے اور کبھی کثرت کا اور یہاں دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔ یعنی چند سال یا بہت سے سال۔ مگر قرآن کریم نے ﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً﴾ [البقرۃ: 80:2] ''سوائے گنتی کے دنوں کے ہمیں آگ نہیں چھوئے گی۔'' میں اس کا استعمال تھوڑے پر ہی کیا ہے۔

1900 - ﴿اَحْصٰی﴾۔ اِحْصَاءٌ کے معنی ہیں گننا، احاطہ کرنا [نمبر: 1652]۔ مگر ﴿عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ﴾ [المزمل: 20:73] ''وہ جانتا ہے کہ تم اس کی حفاظت نہ کر سکو گے۔'' میں دو طرح پر معنی کیے گئے ہیں۔ تم اس کی طاقت نہیں رکھتے یا تم ان اوقات کی حفاظت نہیں کر سکتے (اور حفاظت سے مراد ان اوقات میں قیام ہے جیسا کہ وہاں سیاق سے ظاہر ہے یا اعمال صالحہ سے حفاظت) اور حدیث میں آتا ہے [إِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَتِسْعِينَ اسْمًا مَنْ أَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ] (جامع الترمذی، کتاب الدعوات، باب 87، حدیث: 3850) تو اس سے مراد اسمائے الٰہی کا گننا نہیں بلکہ ان کا علم حاصل کرنا، ان پر ایمان لانا اور یقین رکھنا ہے۔ اور بعض کے نزدیک ان کے مقتضی کے مطابق عمل کرنا۔ (ل)

دو فریق کون ہیں اور بعث اور زمانہ بعث کے احصاء سے کیا مراد ہے؟ دو فریق کے متعلق ذیل کے اقوال ہیں۔

① قوم اصحاب کہف کے دو گروہ اور وہ دونوں کافر تھے یا ایک کافر اور ایک مسلم گروہ تھا۔ (ج)

② خود اصحاب کہف اور وہ لوگ جن کے وقت میں وہ اٹھے

③ یہود اور نصاریٰ،

④ خالق اور مخلوق جیسے ﴿ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ﴾ بعث سے مراد نیند سے جاگنا اور احصائے مدت سے مراد سالوں کی گنتی رکھنا سمجھا گیا ہے۔ لیکن سالوں کی گنتی کا حساب کوئی ایسا واقعہ نہیں جس پر اللہ تعالیٰ لِنَعْلَمَ کا لفظ فرماتا۔

پیچھے کئی موقعوں پر دکھایا جا چکا ہے کہ ایسے موقعہ پر علم الٰہی سے مراد ایک امر کے واقعہ ہو جانے کا علم ہوتا ہے جو پہلے غیب میں ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر اس علم کا دوسروں پر ظاہر کرنا جیسے مثلاً ﴿وَ لَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ﴾ [آل عمران: 142:3] ''حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو نہیں جانا جو جہاد کرتے ہیں۔'' میں مراد اصلی یہ ہے کہ ایسے واقعات ظاہر ہو جائیں جن سے لوگوں کو یہ علم ہو جائے کہ مجاہد کون ہے۔ کیونکہ یہ علم پہلے غیب میں تھا کہ مجاہد کون ہے۔ جب جہاد کا موقعہ آ گیا تو اللہ تعالیٰ کا علم وقوع میں آ گیا یعنی دوسروں پر ظاہر ہو گیا۔ گویا علم الٰہی دو طرح پر ہے۔ ایک وہ جو پردہ غیب میں ہے جس کا لوگوں کو

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًى ﴿۱۳﴾

ہم ان کی خبر تجھ پر حق کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ وہ (کئی) جوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے انہیں ہدایت میں بڑھایا۔ (1901)

کوئی علم نہیں ہوتا اور دوسرا وہ جو واقع ہو جاتا ہے۔ تو اس کا علم دوسروں کو بھی ہو جاتا ہے۔ اور ایسے موقعوں پر یہ دوسری قسم کا علم ہی مراد ہوتا ہے۔ اب سالوں کی گنتی کوئی ایسا واقعہ نہیں بلکہ اس قسم کا علم ہمیشہ انسانوں کے اعمال سے تعلق رکھتا ہے۔ کیونکہ وہی علم ہے جو پہلے پردہ غیب میں ہوتا ہے اور پھر وقوع میں آتا ہے۔ اس لیے اَحْصٰی کے معنی بھی اسی کے مطابق لیے جائیں گے یعنی اس وقت کی حفاظت کرنا یا جس غرض کے لیے انسان کو زندگی دی گئی ہے اس کے مطابق عمل کرنا یا ان اوقات کی اعمال صالحہ سے حفاظت کرنا اور بعث سے [دیکھو نمبر: 315] مراد ان کا کہف سے نکل کر دنیا میں جانا ہے یعنی جب انہوں نے اپنی تنہائی اور خلوت غار کی مدت کو بہترین طریق پر صرف کیا تو ہم نے انہیں دوسرے لوگوں کی طرف بھیجا تا کہ وہ اوروں کے لیے نیکی کا نمونہ بنیں اور دکھا دیں کہ عبادت الٰہی سے انسان کس بلند مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ اور ان کا غار میں جانا اسی غرض کے لیے تھا کہ وہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے دنیا میں نکلیں جیسا کہ [نمبر: 1898] میں دکھایا جا چکا ہے۔ نہ اس لیے کہ وہ غار میں پڑے سوئے رہیں۔ انسان کی زندگی کی غرض سو رہنا نہیں کہ اللہ تعالیٰ اصحاب کہف کے سو رہنے کے قصہ کو ہمارے لیے اپنی ہدایت کے طور پر ذکر کرتا بلکہ وہ غرض اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ اصحاب کہف کا غار میں رہنا محض ایک وقفہ تھا جس کے اندر ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے سہولت کی راہ پیدا کر دی اور دو فریق جن کا یہاں ذکر ہے ایک تو خود اصحاب کہف ہیں جن کو غار میں پناہ لینی پڑی مگر انہوں نے حق کو نہ چھوڑا اور دوسرا وہ دنیاداروں کا گروہ ہے جن کے ظلم سے انہیں پناہ لینی پڑی اور جن کی نظر دنیا سے اوپر نہ اٹھ سکی اور وہ انسانیت کے مقام بلند کو نہ دیکھ سکے۔

تاریخ عیسائیت پر ان بیانات سے جو روشنی پڑتی ہے اس کا ذکر آگے آئے گا۔ لیکن نبی کریم ﷺ کی زندگی کے واقعات کی طرف بھی اس قصہ میں اشارہ ہے اور اس کو خود قرآن کریم نے [آیت: 24] میں ان الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے ﴿وَ قُلْ عَسٰۤی اَنْ یَّهْدِیَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾﴾ یعنی جس قدر عرصہ اصحاب کہف کو غار میں رہنا پڑا اللہ تعالیٰ اس سے بہت قریب آنحضرت ﷺ کے لیے سامان پیدا کر دے گا۔ یہ سورت ہجرت سے بہت پیشتر زمانہ کی ہے اور ایسا ہی واقعہ ہوا کہ آپ کو بھی کفار کے ہاتھ سے ایک غار میں پناہ لینی پڑی۔ مگر آپ کو ﴿سِنِیْنَ عَدَدًا﴾ یعنی کئی سال کی جگہ صرف تین دن رہنا پڑا اور اس کے بعد اعلائے کلمۃ اللہ کے کام کے لیے مدینہ میں پہنچ کر رستے کھل گئے اور دوسری طرف تاریخ عیسائیت اور تاریخ اسلام میں بھی یہی [اَقْرَبُ رُشْدَ] نظر آتا ہے۔ یعنی عیسائیت تین سو سال تک مغلوبیت کی حالت میں رہی اور اسلام تین سو سال کے اندر اندر ساری روئے زمین پر پھیل گیا اور ساری دنیا پر اس کی حکومت قائم ہو گئی۔

1901 - اس رکوع میں [آیت: 10] کے مضمون کو ہی بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اصحاب کون تھے؟ کہاں کے رہنے والے تھے؟ ان

وَّ رَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاْ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ﴿۱۴﴾

اور ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کیا جب وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا ہمارا رب آسمانوں اور زمین کا رب ہے ہم اس کے سوائے کسی اور معبود کو نہ پکاریں گے کیونکہ اس صورت میں ہم (ایسی بات) کہیں گے جو حق سے دور ہے۔ (1902)

هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ؕ لَوْ لَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ﴿۱۵﴾

ان ہمارے لوگوں نے اس کے سوائے اور معبود بنا لیے ہیں کیوں ان پر کوئی کھلی سند نہیں لاتے۔ پس اس سے زیادہ کون ظالم ہے جو اللہ پر جھوٹ افترا کرتا ہے۔

وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ يُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ﴿۱۶﴾

اور جب تم ان سے علیحدہ ہو گئے ہو اور اس سے جس کی وہ اللہ کے سوائے عبادت کرتے ہیں تو غار میں پناہ لو تا کہ تمہارا رب تمہارے لیے اپنی رحمت (کے سامان) پھیلا دے اور تمہارے کام میں سہولت مہیا کر دے۔ (1903)

کے نام کیا تھے؟ یہ نہیں بتایا کیونکہ ناموں کے جاننے سے کوئی خاص فائدہ بھی نہیں۔ جو مطلب کی بات تھی وہ بتا دی۔ وہ مومن تھے اور معمولی طور پر ایمان لانے والے نہ تھے بلکہ ہدایت کے ایک اعلیٰ مرتبہ پر تھے۔ اور اعلیٰ مرتبہ ہدایت پر وہی لوگ کہلاتے ہیں جو تمام اغراض دنیا کو چھوڑ کر اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں۔ بِالْحَقِّ کا لفظ لا کر بتا دیا کہ جو قصے مشہور تھے وہ صحیح نہ تھے اور انہی میں سے یہ سوئے رہنے کا قصہ ہے۔

1902 - ﴿رَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ﴾ [دیکھو نمبر: 1211]، اور [رَبَطَ اللّٰهُ عَلٰى قَلْبِهٖ بِالصَّبْرِ] سے مراد ہے کہ اللہ نے اس کے دل میں صبر ڈال دیا اور اسے مضبوط اور قوی کر دیا۔ (ل)

شَطَطَ۔ [اَلْاِفْرَاطُ فِي الْبُعْدِ] یعنی بہت دوری۔ اور شَطَطَ کہنے سے مراد ایسا قول ہے جو حق سے بہت دور ہو۔ (غ)

یہی پہلے عیسائیوں کا مذہب تھا یعنی ایک خدا کے سوا دوسرے کو پکارنا خواہ اس کا نام بیٹا رکھا جائے یا کچھ اور حق سے بہت دور بات ہے۔ آج مسیحیت کی تعلیم مسیح کی تعلیم کے بالکل خلاف ہے اور اسی لحاظ سے یہ تعلیم مسیح الدجال کی تعلیم ہے۔

1903 - يَنْشُرْ۔ نَشَرَ کے معنی پھیلانا ہیں کپڑا ہو یا کاغذ یا نعمت یا بات۔ اور نشور مردہ کا جی اٹھنا ﴿وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ﴾ [التکویر:

وَ تَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ اِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَ هُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿۱۷﴾ ع 2 5 14

اور تو سورج کو دیکھے گا کہ جب وہ نکلتا ہے تو ان کے غار سے دائیں طرف کو جھک جاتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو ان سے بائیں طرف کترا جاتا ہے اور وہ اس کے ایک کھلے میدان میں ہیں۔ یہ اللہ کے نشانوں میں سے ہے جسے اللہ ہدایت دے تو وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے وہ گمراہی میں چھوڑ دے تو تُو اس کے لیے کوئی دوست راہ بتانے والا نہ پائے گا۔ (1904)

10:81] ''اور جب صحیفے پھیلا دیئے جائیں گے۔'' ﴿وَ النُّشِرٰتِ نَشْرًا﴾ [المرسلات: 3:77] ''اور دور دور پھیلا دینے والی۔'' ﴿وَ اِلَيْهِ النُّشُوْرُ﴾ [الملك: 15:67] ''اور اس کی طرف (موت کے بعد) اٹھ کر جانا ہے۔'' (غ)

﴿يُهَيِّئْ﴾۔ هَيْئَةٌ وہ حالت ہے جس پر کوئی چیز محسوس ہو یا معقول ﴿كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ﴾ [المآئدة: 110:5] ''پرند کی صورت کی مانند۔'' (غ) اور تَهْيِئَةٌ کسی ہیئت کا بنا دینا ہے پھر کسی چیز کے لا موجود کرنے یا اس کے سہل کر دینے پر بھی بولا جاتا ہے۔ (ر) مِرْفَق کے لیے [دیکھو نمبر:793]۔

یہاں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ غار میں صرف ایک وقت کے لیے پناہ لیتے ہیں اور ان کی دعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی اور رستہ کھول دے جو ان کے لیے نفع کا موجب ہو۔ جیسا کہ لفظ مِرْفَق لا کر بتا دیا۔ غرض لفظ لفظ سے یہ شہادت ملتی ہے کہ اصحاب کہف کے مدنظر کوئی عظیم الشان کام تھا۔

1904 - ﴿تَّزٰوَرُ﴾۔ زَارَهُ کے معنی ہیں اس سے ملاقات کی اور زَوْرٌ میلان کو کہتے ہیں اور تَّزٰوَرُ اصل میں تَتَزَاوَرُ ہے اور اس کے معنی ہیں تَمِيْلُ یعنی مائل ہونا اور زُوْرٌ جھوٹ کو کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی اصل جہت سے ایک طرف جھک جانا ہے ﴿ظُلْمًا وَّ زُوْرًا﴾ [الفرقان: 4:25] ''ظلم اور جھوٹ۔'' ﴿قَوْلَ الزُّوْرِ﴾ [الحج: 30:22] ''جھوٹ بات۔'' (غ)

تَّقْرِضُ۔ قَرَضٌ کے معنی قطع یا کاٹنا ہیں اور کسی جگہ سے کترا کر یعنی ایک طرف ہو کر نکل جانے پر بھی بولا جاتا ہے۔ (غ)

فَجْوَةٍ اس کا اصل فَجَا ہے اور دو چیزوں کے درمیان جو کھلی اور وسیع جگہ ہوا سے فَجْوَةٌ کہا جاتا ہے۔ (غ)

کہف سے سورج کے پھر جانے سے مراد:

حاصل مطلب آیت کے پہلے حصہ کا تو صرف اس قدر ہے کہ یہ لوگ ایسی جگہ پر تھے جہاں انہیں غار کی تنگی اور سورج کی دھوپ ایذا نہیں دیتی تھی۔ پھر بعض کے نزدیک یہ اس لیے تھا کہ کہف کا دروازہ بنات نعش کے مقابل پر تھا اور بعض کے نزدیک اللہ تعالیٰ خرق عادت کے طور پر سورج کو ان کی غار سے پھیر دیا کرتا تھا اور گروہ ثانی کے نزدیک ﴿ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ اس کی

وَ تَحْسَبُهُمْ اَیْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُوْدٌ ۚ وَّ نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْیَمِیْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ ۚ وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَیْهِ بِالْوَصِیْدِ ؕ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَیْهِمْ لَوَلَّیْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا

اور تُو انہیں جاگتے ہوئے سمجھتا ہے اور وہ سوئے ہوئے ہیں اور ہم انہیں دائیں بائیں پھیرتے ہیں، اور ان کا کتا چوکھٹ پر اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے ہے اگر تو ان پر جھانکے تو بھاگتا ہوا ان سے پیٹھ پھیر لے

دلیل ہے۔ (ر) اور ابن کثیر کہتے ہیں کہ ان الفاظ سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ کہف کا دروازہ شمال کی طرف تھا کیونکہ اگر مشرق، مغرب یا جنوب کی طرف ہوتا تو یہ بات اس پر صادق نہ آتی۔ اور ﴿مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ﴾ اسے اس لیے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی غار کی طرف ہدایت دے دی۔ (ت)

کہف اور اس کا محل وقوع:

اور جو کچھ ابن کثیر نے کہا ہے وہ بالکل درست ہے۔ کیونکہ خط استوا سے شمال کی طرف شمال رخ مکانات میں دھوپ کم داخل ہوتی ہے اور خط استوا سے جس قدر زیادہ شمال کی طرف جگہ ہوگی اسی قدر زیادہ اس پر یہ الفاظ صادق آئیں گے۔ اور مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ جگہ ایلہ کے قریب تھی اور بعض کے نزدیک نینوا کے قریب اور بعض نے اسے بلاد روم میں اور بعض نے بلاد بلقاء میں قرار دیا ہے۔ لیکن جس طرح یہ الفاظ ایسی غار پر صادق آتے ہیں اس سے بڑھ کر صحت کے ساتھ کسی شمالی ملک پر صادق آتے ہیں۔ کیونکہ شمالی ممالک میں سورج سر پر نہیں آتا بلکہ نیچے کی طرف مائل رہتا ہے یعنی طلوع سے لے کر دوپہر تک دائیں طرف جھکا رہتا ہے اور دوپہر سے لے کر غروب تک بائیں طرف کو جھکا رہتا ہے۔ اور ایسے ممالک میں سورج کی تیزی بہت کم ہوجاتی ہے۔ جیسے ممالک یورپ ہیں کہ ان سب پر یہ بیان نہایت صفائی سے صادق آتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ عیسائیت کا پہلا رخ شمال کی طرف ہی ہوا ہے۔ اور بعض روایات سے جن کا ذکر انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یوسف آرمیتیا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دولت مند شاگردوں میں سے تھا مع کچھ اور رفقا کے انگلستان میں آیا۔ چنانچہ مضمون یوسف آرمیتیا کے نیچے لکھا ہے کہ سینٹ فلپ نے یوسف آرمیتیا کو انگلستان بھیجا اور وہ سمرسٹ شائر (انگلستان) میں ایک چھوٹے سے جزیرہ میں آکر رہا۔ اسی انسائیکلو پیڈیا کے دسویں ایڈیشن میں ہے کہ یوسف آرمیتیا 63ء میں پھرتا پھرتا برطانیہ میں آیا اور بھی بہت سی روایات ہیں جن کو جب اس تاریخی امر کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے کہ یوسف آرمیتیا کا نام حواریوں کی ان سرگرمیوں میں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اس ملک میں جاری رہیں نظر نہیں آتا تو یہ یقینی معلوم ہوتا ہے کہ یوسف ارمیتیا کسی دوسری جگہ چلا گیا۔ اور مظالم تو ابتدائی عیسائیوں پر ہوتے ہی تھے۔ اور غالباً اور بھی کوئی شاگرد یا مسیحی مذہب کے پیرو اس کے ساتھ آئے ہوں گے۔ پس ہوسکتا ہے کہ کہف سے مراد یہی ملک انگلستان ہی ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ دوسرے یورپ کے ممالک بھی ہوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ کہف کوئی غار ہو جو کسی اور جگہ شمال رُخ واقع ہو۔

وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ⑱ اور تجھ پر ان کی دہشت چھا جائے۔ (1905)

1905 - اَیْقَاظ۔ یَقَظَۃٌ نیند کی ضد ہے اور فعل اِستَیْقَظَ ہے اور یَقْظَانٌ صفت ہے جس کی جمع اَیْقَاظٌ ہے اور یہ یَقِظٌ اور یَقُظٌ کی بھی جمع ہے جس کے معنی ہیں چوکس۔ یعنی جس شخص میں معرفت اور ذہانت ہو۔ (ل)

رُقُوْدٌ۔ رُقَادٌ۔ اچھی تھوڑی نیند کو کہتے ہیں اور رُقُوْدٌ مصدر بھی ہے اور رَاقِدٌ کی جمع بھی۔ (غ) اور [رَقَدَ الْحَرُّ] کے معنی ہیں گرمی ساکن ہوگئی اور [اَرْقَدَ بِالْمَکَانِ] کے معنی ہیں مکان میں قیام کیا۔ (ل)

وَصِیْدٌ۔ گھر اور کوٹھڑی کے صحن کو کہتے ہیں اور وَصِیْدَۃٌ اس گھر کو کہا جاتا ہے جو پہاڑوں کے اندر پتھروں سے مال کے لیے بنایا جائے۔ (ل) [اَوْصَدَتَ الْبَابِ] کے معنی ہیں اسے بند کر دیا اور مضبوط کر دیا اور یہی معنی اٰصَدَ کے ہیں اور مُؤْصَدَۃ اسی سے ہے ﴿اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۝﴾ [الھمزۃ: 8:104] ''وہ ان پر بند کر دی گئی۔'' یعنی ہر طرف سے ان پر بند کیا گیا۔ (ل) اور بعض نے وَصِیْدٌ کے معنی چوکھٹ یا دروازہ بھی کیے ہیں۔ (ج)

اَطَّلَعْتَ۔ طَلَعَ سورج کے نکلنے پر بولا جاتا ہے اور اسی سے طَلَعَ اور اِطَّلَعَ (مصدر اِطِّلَاعَ) کے معنی ہیں ایک چیز کو دیکھ کر اس کی حالت کی خبر پائی۔ (غ) ﴿هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ﴾ [الصافات: 54:37] ''کیا تم جھانکنا چاہتے ہو۔'' ﴿فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى﴾ [المؤمن: 37:40] ''پھر موسیٰ کے خدا کو دیکھوں۔''

اصحاب کہف کا سونا:

اگر یہاں انہی لوگوں کا ذکر ہے جو غار میں چلے گئے تھے تو ظاہر ہے کہ یہ صدیوں یا سالوں کی نیند نہیں کیونکہ لفظ رقود کی تشریح جو امام راغب نے کی ہے اس کے لحاظ سے یہ لفظ تھوڑی نیند پر بولا جاسکتا ہے نہ اتنی لمبی اور گہری نیند پر۔ لیکن یہاں پر کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

1. اول: یہ کہ اس سے کیا مطلب ہے کہ وہ سو رہے تھے اور دیکھنے والا انہیں جاگتا ہوا سمجھتا۔ بعض نے کہا ان کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔ بعض نے کہا شدت حفاظت اور قلت تغیر جو ان پر تھا اس کے لحاظ سے۔ بعض نے کہا کروٹ لینے کی وجہ سے، ان ساری توجیہات میں کوئی تسلی بخش جواب نہیں۔ اور لکھا ہے کہ کروٹ سال میں ایک دفعہ یا چھ ماہ میں ایک دفعہ لیتے تھے اور آنکھیں کھلی رکھنے کا کیا مطلب تھا اور پھر اس سارے قصے کو دہرانے کا کیا منشا ہے۔
2. دوم: کتے کا ذکر یہاں ساتھ شروع کیا۔ آیا وہ بھی بطور اعجاز سویا رہا یا نہیں۔ بعض کہتے ہیں سویا رہا، بعض کہتے ہیں سویا نہیں پہرہ دیتا تھا اور اسے غذا اپنے ہاتھ چاٹنے سے پہنچ جاتی تھی۔ اس پہرہ کا کیا منشا تھا۔ کیا جس طرح سانپ اور بچھو سے ان کی حفاظت کی گئی، اسی طرح جنگلی درندوں وغیرہ سے ان کی حفاظت نہ ہوسکتی تھی۔
3. سوم: کروٹیں بدلاتے رہنے میں کس حکمت کا اظہار ہے۔ اگر بطور اعجاز تین سو سال تک سوئے رہے تو یہ اعجاز کیا خدا تعالیٰ کی قدرت سے باہر تھا کہ بغیر کروٹ بدلنے کے وہ پڑے رہتے، اور اگر کروٹیں لیتے بھی تھے تو اس ذکر کا یہاں کیا مطلب ہے۔

وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ
قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا
لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ
اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ
بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ
اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ
وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ⑲

نصف القرآن باعتبار عدد الحروف بأنّ التاء بعد الیاء من النصف الاول والامام الثانیۃ من النصف الاخیر ۱۲

اور اسی طرح ہم نے انہیں اٹھا کھڑا کیا تا کہ ایک دوسرے سے سوال کریں۔ ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ تم کتنی مدت ٹھہرے رہے (بعض نے) کہا ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے رہے (اوروں نے) کہا تمہارا رب خوب جانتا ہے تم کتنا ٹھہرے رہے۔ اب اپنے میں سے ایک کو اپنے اس روپے کے ساتھ شہر کی طرف بھیجو سو وہ دیکھے کہ کون سا ان میں زیادہ ستھرا کھانا ہے۔ پس تمہارے پاس اس میں سے کھانا لائے اور چاہیے کہ وہ نرمی کرے اور تمہارا پتہ کسی کو نہ لگنے دے۔ (1906)

اقوام یورپ کی دنیوی ہوشیاری اور دینی غفلت:

میرے نزدیک اس آیت میں ذکر ان لوگوں کا ہے جن کی طرف پچھلے رکوع کی آخری آیت میں ﴿مَنْ يُّضْلِلِ﴾ کہہ کر اشارہ کیا ہے یعنی انہی اصحاب کہف کے جانشین جو دنیا میں غرق ہو کر اصحاب الرقیم بنے۔ اپنی دنیوی جدوجہد کے لحاظ سے وہ ایقاظ ہیں نہ صرف جاگتے ہیں بلکہ کمال درجہ کی مستعدی اور ذہانت دکھا رہے ہیں۔ لیکن حقیت سے بے خبر ہونے کے لحاظ سے وہ سوئے ہوئے ہیں اور دنیا میں دائیں بائیں یعنی ہر جانب میں پھر بھی رہے ہیں اور کوئی جگہ نہیں جسے انہوں نے چھوڑا ہو۔ اور حدیث میں جو دجال کا ذکر آتا ہے کہ اس کی دائیں آنکھ ماری ہوئی ہوگی تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اس کی دینی آنکھ اندھی ہوگی۔ اور یوں حدیث اسی آیت کے مضمون کو دہراتی ہے۔ اور کتے کا ذکر اس لیے کیا کہ یہ بھی ان کی خصوصیت ہے۔ جس قدر محبت اس قوم نے کتے سے کی ہے اور کسی نے نہیں کی اور ان کی عورتیں کتوں کو گودیوں میں لے کر بچوں سے زیادہ محبت کرتی ہیں۔ کتوں کا منہ چاٹتے اور چومتے بلکہ ان کی زبانوں تک چوستے ہیں۔ اور قریباً ہر شخص کتا بھی ضرور اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ شاید کوئی مناسبت روحانی بھی ہے کیونکہ حرص میں ضرب المثل ہے اور ان قوموں کی مال دنیا کی حرص بھی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے اور یا کتے سے مراد انہی قوموں میں سے کوئی قوم ہے جو بسبب اپنی وسیع طاقت کے گویا ہر وقت چوکھٹ پر موجود ہے اور ان کے لیے محافظ کا کام دیتی ہے۔ اس کے لیے [دیکھو نمبر: 1908]۔ اور آخر میں ان کی ظاہری شان وشوکت کا ذکر کیا جو اس قدر ہے کہ ان ظاہری سامانوں کو دیکھ کر جو ان میں سے قریباً ہر شخص کو میسر ہیں دیکھنے والا مرعوب ہو جاتا ہے۔

1906 - وَرِقٍ۔ وَرَقٌ درخت کے پتوں کو کہتے ہیں واحد وَرَقَةٌ ہے اور جمع اَوْرَاقٌ ﴿وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ﴾ [الأنعام: 59:6] ''اور کوئی پتا نہیں گرتا۔'' (اور کتاب کے ورقوں کو بھی) اور مال کثیر کو بھی کہتے ہیں۔ گویا وہ اپنی کثرت میں درخت کے پتوں کی

اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَ لَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۲۰﴾

کیونکہ اگر وہ تم پر غالب آ جائیں تو تمہیں سنگسار کریں گے یا اپنے مذہب میں لوٹا دیں گے اور اس وقت تم کبھی کامیاب نہ ہو گے۔

طرح ہے۔اسی لحاظ سے مال کو تَرٰی یا تُرَابٌ یا سَیْلٌ بھی کہا جاتا ہے اور وَرِقٌ اور وَرَقٌ کے معنی دراہم یا روپے ہیں۔(غ)

یَتَلَطَّفْ۔ لَطِیْفٌ اسمائے الٰہی میں سے ہے جس کے لیے [دیکھو نمبر: 994] اور لطیف وہ ہے جو حاجت نرمی سے پہنچا دے اور ابن اثیر کہتے ہیں لطیف وہ ہے جس میں یہ چیزیں جمع ہوں یعنی فعل میں نرمی اور باریک مصالح کا علم اور اس کی طرف پہنچانا جس کے لیے اس کا اندازہ کیا ہے اور لُطْفٌ دوسرے سے نرمی کرنا ہے اور کسی امر میں تَلَطُّفْ اس کے لیے تَرَفُّق یا نرمی ہے۔

اس آیت میں پھر اصحاب کہف کا ذکر ہے۔[آیت:16] میں فرمایا تھا کہ جب غار میں گئے تو انہوں نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی مفید راہ پیدا کر دے تو اللہ تعالیٰ نے آخر انہیں اس غرض کے لیے اٹھا کھڑا کیا۔ رہا یہ سوال کہ کتنی مدت رہے؟ سو [آیت:11] میں اسے ﴿سِنِیْنَ عَدَدًا﴾ کہا ہے۔یعنی کئی سال اور یہی انسانی زندگی کے لحاظ سے صحیح مدت ہے۔[آیت: 25] کے تین سو سال پر اس آیت کے نیچے بحث ہوگی اور ان میں سے بعض کا یہ کہنا کہ ہم دن یا دن کا کچھ حصہ رہے اس لحاظ سے ہے کہ یوم کا لفظ وسیع معنی میں ہے اور چوبیس گھنٹے کا دن نہیں اور شاید ان کا منشا یہی ہو کہ ہم نے تو گویا اپنی عمر ہی یہاں گزار دی یا عمر کا بڑا حصہ گزار دیا اور ﴿رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ﴾ میں یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ہی منشائے الٰہی تھا یعنی یہ وقت بھی ضائع نہیں ہوا بلکہ اس میں کام کے لیے ایک تیاری ہوگئی اور عبادت الٰہی سے بعض اخلاق تکمیل کو پہنچ گئے، جن کی تکمیل کی ضرورت دعوت الی اللہ کے کام کے لیے تھی۔اس کے بعد وہ کام کرنے کی تجویز سوچتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ایک آدمی کو روپے دے کر شہر میں بھیجو کہ وہ اچھا کھانا لائے اور یوں کچھ تعلقات اہل شہر کے ساتھ قائم ہوں اور گفتگو اور تبلیغ میں نرمی کا پیرایہ اختیار کرے تاکہ آہستہ آہستہ لوگوں کا رجوع حق کی طرف ہو اور کسی کو پتہ نہ لگنے دے کہ اصل کیا منشا ہے۔ یہاں اگر یہ خیال گزرے کہ اس سے پہلے یہ لوگ کھانا نہیں کھاتے ہوں گے تو یہ صحیح نہیں۔اس لیے کہ جو لوگ غاروں میں تنہا رہتے ہیں وہ کھانے پینے کا سامان بھی کر لیتے ہیں۔ یا زیادہ تر ایسی چیزوں پر گزارہ کر لیتے ہیں جو جنگلوں میں پیدا ہوتی ہیں۔مدینہ یا شہر میں بھیجنے سے مراد یہی ہے کہ آہستہ آہستہ لوگوں کے ساتھ تعلقات پیدا کیے جائیں۔ یہ نقشہ اگر چند اصحاب کہف کا ہے تو عیسائیت کی ابتدائی تاریخ بھی اسی کے مطابق ہے۔کیونکہ عیسائیت قریباً تین سو سال محکومیت کی حالت میں رہی اور اس وقت اس کی تبلیغ نہایت نرمی کے طریق سے کی جاتی تھی اور چھپ کر کی جاتی تھی، علانیہ تبلیغ نہ ہو سکتی تھی۔جیسا کہ اگلی آیت میں بھی اسی طرف اشارہ ہے۔اور عجیب بات یہ ہے کہ آج یورپ کی عیسائی اقوام اپنے سیاسی مقاصد کے حاصل کرنے میں بھی اسی طریق کا تتبع کرتی ہیں۔یعنی جس ملک میں یہ لوگ قدم رکھتے ہیں پہلے تجارت کے بہانہ سے جاتے ہیں اور نرمی کا طریق اختیار کر کے آہستہ آہستہ ملک کے اندر تصرف تام حاصل کر لیتے ہیں۔اور اس تصرف کے حاصل کرنے میں ان کے بڑے معاون دراہم

وَ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ؕ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ﴿۲۱﴾

اور اسی طرح ہم نے (لوگوں کو) ان پر مطلع کر دیا، تا کہ وہ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور کہ قیامت میں کچھ بھی شک نہیں۔ جب وہ ان کے معاملہ میں ایک دوسرے سے جھگڑنے لگے تو انہوں نے کہا ان پر ایک عمارت بنا دو۔ ان کا رب ان کو خوب جانتا ہے جو لوگ اپنے امر پر غالب ہوئے۔ انہوں نے کہا ہم ضرور ان پر مسجد بنائیں گے۔ (1907)

ہیں یعنی روپے دے کر اپنا کام نکال لیتے ہیں اور اپنے اصل ارادہ پر کسی کو مطلع نہیں ہونے دیتے۔ پس اصحاب کہف کے قصہ میں یہاں بھی تاریخ عیسائیت ہی لکھی ہے۔

1907 - **اصحاب کہف کی اصل منشا پر اطلاع پانا:** ﴿ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ ﴾ میں عموماً یہ مراد لی گئی ہے اور اسی طرح پر یہ قصہ مفسرین نے بیان کیا ہے کہ درہم کی وجہ سے جو تین سو سال کا پرانا سکہ تھا لوگوں کو ان کی خبر مل گئی اور انہوں نے آ کر انہیں دیکھا (اور بعض روایتوں میں ہے کہ انہیں دیکھا نہیں بلکہ جب کبھی کوئی شخص جرأت کر کے دیکھنے کے لیے آگے بڑھتا دہشت زدہ ہو کر واپس ہو جاتا) کہ یہ تین سو سال کے لوگ ہیں اس لیے ان کو یہ بھی یقین آ گیا کہ قیامت حق ہے یعنی مردوں کو پھر زندہ کیا جائے گا۔ لیکن یہاں پر مفسرین کو خود شبہ پیدا ہوا ہے کہ اگر ایک طویل زمانہ تک اصحاب کہف کا سونا اور اس پر یقین کرنا مان بھی لیا جائے تو بھی اس سے یہ علم پیدا نہیں ہوتا کہ مرجانے کے بعد انسان زندہ ہوگا اور اس کا جواب صرف یہ دیا گیا ہے کہ دونوں باتیں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر دلالت کرتی ہیں۔ یعنی جو خدا اتنی مدت تک جسموں کو محفوظ رکھ سکا وہ دوبارہ زندہ بھی کر سکتا ہے۔ مگر سوال تو پھر وہی باقی رہتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی ایک قدرت کے مشاہدہ سے دوسری قدرت کا علم حاصل ہو جاتا ہے تو پھر اس قدرت کے ہزار ہا نظارے تو انسانی آنکھوں کے سامنے ہر دم ہوتے رہتے ہیں وہی کافی ہیں۔ ایک جسم کے لمبی مدت تک محفوظ رہ جانے سے یہ علم پیدا نہیں ہوتا کہ موت کے بعد جب اجزائے جسم متفرق ہو جائیں گے پھر انسان کو زندہ کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں یہ بھی قابل تسلیم نہیں کہ ایک شخص کے بیان پر اعتبار کر کے لوگوں کو اس قدر یقین حاصل ہو گیا ہو۔ میرے نزدیک ﴿ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ ﴾ میں ان کے اصل مقصد پر مطلع کر دینا ہے۔ یعنی یوں ہی وہ نرمی کے پیرایہ میں لوگوں کو سمجھاتے رہے یہاں تک کہ لوگوں کو اس بات کا علم ہو گیا کہ جس بات کی طرف یہ بلاتے ہیں وہ سچ ہے اور بعث بعد الموت بھی بلا شبہ صحیح ہے۔ قیامت پر یقین لوگوں کو انبیاء کی تعلیم سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے جب نیکی اور اخلاق کی تعلیم آہستہ آہستہ ان کے اندر پھیلا دی تو ان کے حق پر ہونے کا یقین بھی ان کو آ گیا۔

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ؕ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۬ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۪

کہیں گے وہ تین ہیں، ان کا چوتھا ان کا کتا۔ اور کہیں گے پانچ ہیں اور ان کا چھٹا ان کا کتا ہے۔ اٹکل پچو باتیں کرتے ہیں۔ اور کہیں گے سات ہیں اور ان کا آٹھواں ان کا کتا ہے۔ کہہ دے میرا رب ان کی گنتی بہتر جانتا ہے سوائے تھوڑوں کے انہیں کوئی نہیں جانتا۔ سو ان کے بارے میں جھگڑا نہ کر سوائے (اس کے کہ) ظاہر جھگڑا (ہو)

اقوام یورپ کے اصل منشا پر لوگوں کا اطلاع پالینا:

اور اگر عیسائیت کی تاریخ میں موجودہ ارادوں کے متعلق اسے لیا جائے تو بھی درست ہے۔ کیونکہ آخر کار دنیا ان اقوام کے ارادوں پر مطلع ہوگئی۔ اور اس صورت میں لِيَعْلَمُوْٓا کی ضمیر خود ان لوگوں کی طرف جائے گی یعنی دنیا کے ان کے ارادوں پر اطلاع پا جانے سے جب انہیں دنیا میں ناکامی ہوگی تو پھر حق کی طرف توجہ ہوگی اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہی زندگی ہی سب کچھ نہیں جس پر انہوں نے اپنا سارا زور لگا دیا۔ بلکہ اس کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے۔

آیت کے پچھلے حصہ میں انہی لوگوں کا ذکر ہے جن کے پیغام کو انہوں نے قبول کیا یعنی یا تو یہ حالت تھی کہ ان کی بات کوئی نہ سنتا تھا اور یا اب ان کی نیکی کی وجہ سے ان کی یادگاریں بنانے کی تجویزیں ہونے لگیں اور اس کے بھی بعد ایک اور مرحلہ آیا کہ وہ لوگ جنہیں پوری حکومت اور غلبہ ملا یعنی جب عیسائیت غالب ہوگئی، [﴿غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ﴾ سے مراد غلبہ ہی ہے جیسے ﴿وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ﴾ میں یعنی اَمْرِهِمْ کی ضمیر انہی غالب آنے والوں کی طرف ہے [اِنَّهُمْ اِذَا اَرَادُوْٓا اَمْرًا لَمْ يَتَعَسَّرَ عَلَيْهِمْ] (ر)] تو اب انہوں نے انہی صلحا اور نیک لوگوں کو اپنا معبود بنالیا۔ اور عیسائیت میں مسیح کی خدائی کا عقیدہ بھی قسطنطین کے تبدیل مذہب کے ساتھ پختہ ہوا۔ بخاری میں ہے [لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى، اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسْجِدًا.] (صحيح البخارى، كتاب الجنائز، باب مَا يُكْرَهُ مِنِ اتِّخَاذِ الْمَسَاجِدِ عَلَى الْقُبُورِ، حديث: 1330) یہود اور نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجدیں بنالیا اور ایک اور حدیث میں ہے [إِذَا كَانَ فِيهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ فَمَاتَ بَنَوْا عَلَى قَبْرِهِ مَسْجِدًا، وَصَوَّرُوْا فِيْهِ تِلْكَ الصُّوَرَ.] (صحيح البخارى، كتاب الصلوٰة، باب هَلْ تُنْبَشُ قُبُورُ مُشْرِكِي الْجَاهِلِيَّةِ، وَيُتَّخَذُ مَكَانَهَا مَسَاجِدَ، حديث: 427) یعنی جب ان میں کوئی صالح آدمی مرجاتا تو اس کی قبر پر مسجد بنالیتے اور اس میں یہ صورتیں بنالیتے یعنی نیک لوگوں کی تصویریں بنا کر ان کی عبادت کرتے۔ اسی کی طرف یہاں اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ ان کے غلو کا ذکر ہے اس سے قبروں پر مسجدیں بنانے کا جواز نکالنا عجیب ترین قول ہے۔ جب حدیث صحیح اس کو غلط ٹھہراتی ہے اور یہ شرک کی بنیاد ہے۔

ع 3 5 15 وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾ اور ان کے بارے میں ان میں سے کسی سے نہ پوچھ۔ (1908)

1908- ﴿سَيَقُوْلُوْنَ﴾۔ س مضارع سے خاص ہے یعنی مضارع پر داخل ہوتا ہے اور اس کو استقبال کے لیے خالص کر دیتا ہے اور سَوْفَ بھی یہی کام دیتا ہے مگر بعض کے نزدیک اس کے استقبال میں وسعت زیادہ ہے۔ (مغنی)

﴿تُمَارِ﴾۔ مَرَاءٌ و مِمَارَاۃٌ اور اِمْتِرَاءٌ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی اس چیز میں جھگڑا کرنا جس میں تردد ہو (غ) اور مَرَاءٌ اصل میں جدال ہے یعنی یہ کہ ایک شخص دوسرے سے بات نکلوائے اور [مَرَيْتَ الشَّاۃِ] کے معنی ہیں میں نے بکری کا دودھ نکالا۔ اور اسی لحاظ سے شک اور تردد کے معنی آتے ہیں۔ (ل)

ظَاهِر۔ [ظَهَرَ الشَّيْءَ] کی اصل یہ ہے کہ ایک چیز زمین کی پیٹھ پر یعنی زمین کے اوپر آ گئی (ظَهْرٌ پیٹھ کو کہتے ہیں) پس مخفی نہ رہی اور بَطَنَ جب وہ زمین کے پیٹ میں داخل ہوگئی اور چھپ گئی۔ ﴿مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ﴾ [الأعراف: 33:7] ''جو ان میں سے ظاہر ہوں اور جو چھپی ہوں۔'' پس ہر ایک چیز کو جو کھلی ہو اور آنکھ سے یا دلیل سے معلوم ہو جائے ظَاهِرٌ کہا جاتا ہے۔ (غ) اور یہاں بعض نے معنی غیر متعمق کیے ہیں اور بعض نے مراد لیا ہے ایسا جھگڑا جس کی دلیل کھلی ہو اور ایک قول میں وہ ایسے عالم کا جدال ہے جسے حقیقت خبر کا یقین ہو اور ایک قول ہے جسے لوگ دیکھ لیں اور ایک اور قول ہے جو خصم کی دلیل کو باطل کر دے۔

اس آیت میں آئندہ کا ذکر ہے کہ لوگ ایسا کہیں گے۔ یہ ذکر نہیں کہ پہلے کہتے ہیں۔ مفسرین نے اس کی یوں توجیہ کی ہے کہ قرآن شریف میں جو کچھ ان کا مذکور ہوا اسے سن کر کہیں گے کہ وہ تعداد میں اتنے تھے مگر پھر بھی وہی بات رہتی ہے۔ جب تک پہلے ان میں سے ایسے اقوال موجود نہ ہوں کہ وہ تین تھے یا پانچ تھے، وہ یہ نہیں کہہ سکتے۔ اور جب پہلے ایسے اقوال موجود تھے تو اللہ تعالیٰ نے سَيَقُوْلُوْنَ کیوں فرمایا۔ دوسری دقت یہ ہے کہ اگر قرآن شریف پہلے خود کوئی گنتی ان کی بیان کرتا تو یہ الفاظ موزوں ہوتے کہ اسے سن کر وہ یوں کہیں گے۔ مگر نہ صرف پہلے ہی کوئی گنتی ان کی نہیں بتائی بلکہ بعد میں بھی یہی فرمایا ﴿رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ﴾ ان کی گنتی کو میرا رب ہی بہتر جانتا ہے۔ اور آگے جو فرمایا ﴿مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ﴾ تو وہاں عدت کا لفظ چھوڑ دیا ہے اور صرف یہی فرمایا ہے کہ انہیں سوائے تھوڑوں کے کوئی نہیں جانتا اور اس سے بھی مراد وہ لوگ نہیں ہو سکتے جنہیں ان کا قصہ یا ان کی گنتی معلوم ہو۔ کیونکہ اس لحاظ سے وہ ایسے قابل تعریف نہیں ٹھہر جاتے کہ اس بات کا ذکر قرآن شریف میں کیا جاتا بلکہ یہ قلیل علماء ہی ہیں جو ان لوگوں کی گنتی نہیں بلکہ ان کے حالات کو جانتے ہیں اور ﴿لَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا﴾ میں ضمیر اہل کتاب کی طرف لی گئی ہے [مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ] (ج) جن کا ذکر یہاں سوائے اس کے کوئی نہیں کہ خود اس قصہ میں اہل کتاب کا ذکر ہی اصل مقصود سمجھا جائے یعنی عیسائیت کا۔

عام قول اہل کتاب میں اصحاب کہف کی تعداد کے متعلق سات ہی ہے۔ دوسرے اقوال تین یا پانچ کے اگر ہوئے بھی ہوں تو ان

وَ لَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾

اور کسی چیز کی نسبت (یوں) نہ کہہ کہ میں اسے کل کرنے والا ہوں۔

اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ۫ وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ وَ قُلْ عَسٰۤى اَنْ یَّهْدِیَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾

مگر جو اللہ چاہے اور جب تو بھول جائے تو اپنے رب کو یاد کر اور کہہ امید ہے کہ میرا رب مجھے اس سے قریب تر بھلائی کا رستہ دکھائے گا۔ (1909)

کے بیان کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اور بھی بہتیری غلط باتیں اس قصہ میں مل گئی تھیں (اور ہر ایک ایسے قصہ میں مل جاتی ہیں) جن کا ذکر قرآن شریف نے نہیں کیا۔ میرے نزدیک یہاں زیادہ مدنظر عیسائیت کی تاریخ ہی ہے۔ اور ﴿غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ﴾ میں اس کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے کہ وہ حالت محکومیت سے نکل کر آخر غالب بھی آ گئے اور اسی لیے ثَلٰثَةٌ۔ خَمْسَةٌ۔ سَبْعَةٌ مطلق آیا ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد تین آدمی وغیرہ ہوں یا تین اقوام وغیرہ ہوں یا تین حکومتیں وغیرہ ہوں۔ اور ﴿لَا تَسْتَفْتِ فِیْهِمْ مِّنْهُمْ﴾ میں اشارہ ہے کہ یہ قصہ کے آدمیوں کی گنتی کا ذکر نہیں کیوں کہ یہ ذکر تو ان میں مشہور تھا اور وہ سات ہی انہیں سمجھتے تھے۔ اور پچھلی دو صورتوں میں كَلْبُهُمْ سے مراد کوئی ایسی قوم یا حکومت ہوگی جو ان کے لیے کلب کا کام دے یعنی پہریدار کا یا ان کی حفاظت کرنے والے کا اور كَلْبُهُمْ کی جگہ ایک قراءت كَالَبُهُمْ بھی آئی ہے یعنی [صَاحِبْ كَلْبَهُمْ] (د) اور یوں سب کو ایک ذیل میں شامل کیا ہے۔ یعنی کلب کوئی علیحدہ جنس نہ تھی۔ بایں بھی میں اس آیت کے حل کو مشکلات میں سے سمجھتا ہوں۔ شاید اللہ تعالیٰ آئندہ کبھی کسی پر کھول دے۔ ہاں ایک ممکن توجیہ ان الفاظ کی یہ ہے کہ بڑی عیسائی طاقتیں دنیا میں آٹھ رہی ہیں جس عدد کو قرآن شریف نے علیحدہ کر کے بیان کیا ہے یعنی امریکہ، برطانیہ، فرانس، ہسپانیہ، آسٹریا، جرمنی، اٹلی، روس اور کبھی چار کو ہی سب طاقت کا مالک سمجھا جاتا ہے یعنی امریکہ، برطانیہ، فرانس، روس کو اور کبھی جرمنی اور اٹلی ساتھ مل کر چھ بن جاتی ہیں۔ اور بلاشبہ ان میں سے ایک باقی سب کی حفاظت کا کام بھی دیتی ہے اور ﴿رَّبِّیْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ﴾ میں بتا دیا کہ اصل میں زیادہ ہیں ان کی گنتی کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

1909- ﴿غَدًا﴾۔ غَدًا اصل میں غَدَوٌ ہے اور اس کے معنی کل ہیں اور حدیث عبدالمطلب میں ہے [لَا يَغْلِبَنَّ صَلِيْبِهِمْ وَمِحَالِهِمْ غَدْوَ مُحَالِكٌ] (مصنف عبدالرزاق، جلد5، صفحہ313، حدیث:9718) جہاں غَدَوٌ سے مراد کل کا دن نہیں بلکہ قریب کا زمانہ ہے اور کبھی اس سے مراد اخیر زمانہ ہوتا ہے جیسے ﴿سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ﴿۲۶﴾﴾ [القمر: 26:54] ''کل کو جان لیں گے کہ کون جھوٹا خود پسند ہے۔'' جہاں مراد قیامت کا دن یا فیصلہ کا دن ہے۔ (ل) نیز [دیکھو نمبر: 508]

وَ لَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿۲۵﴾

اور وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے اور نو (اور) بڑھائے۔

رَشَدً۔ رَشْدٌ اور رُشْدٌ کے ایک ہی معنی ہیں [نمبر: 609] اور بعض کے نزدیک رشد صرف اخروی بھلائی پر بولا جاتا ہے اور رُشد دنیوی اور اخروی دونوں پر۔ (غ)

ان آیات کے شان نزول میں جو قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ قریش نے یہود مدینہ سے آنحضرت ﷺ کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ آپ سے اصحاب کہف اور روح اور ذوالقرنین کے متعلق دریافت کرو۔ اگر وہ جواب نہ دے سکے تو جھوٹا ہے اور دریافت کرنے پر آپ نے کل بتانے کا وعدہ کیا اور پھر پندرہ دن تک وحی نازل نہ ہوئی۔ یہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک مشکوک سی روایت ہے اور یہود کا تعلق اصحاب کہف سے کچھ تھا بھی نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جب اصحاب کہف اور ان کی مشکلات کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کس طرح پیغام حق پہنچانے میں انہیں ایک مدت غار میں رہنا پڑا اور آخر ان کو وہ راہ ملی کہ وہ پیغام حق پہنچانے کے قابل ہو گئے یا ضمناً عیسائیت کا ذکر کیا کہ کس طرح تین سو سال کا عرصہ دراز وہ کھلے طور پر اپنے پیغام کو نہ پہنچا سکی تو بالمقابل اسلام کا ذکر کیا جیسا کہ ﴿لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا﴾ سے ظاہر ہے۔ یعنی جو بھلائی کا رستہ ان کو دکھایا گیا اس سے قریب تر کوئی رستہ اللہ تعالیٰ امت محمدیہ کو دکھائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی توحید کو دنیا میں پھیلانا تو ایسا کام ہے کہ خود اللہ تعالیٰ اسے چاہتا ہے۔ بایں فرمایا کہ ایسے کام کی نسبت بھی یہ مت کہو کہ ہم کل یا قریب زمانہ میں ایسا کر لیں گے اور یہاں خطاب عام ہے۔ مگر اصل خطاب انہی لوگوں کو ہے جو داعی الی الحق ہیں کیونکہ اوپر ذکر دعوت الی الحق کا ہی تھا۔ اور یہ جو فرمایا کہ سوائے اس کے کہ اللہ چاہے تو ایک معنی اس کے یوں کیے گئے ہیں کہ ایسا مت کہو سوائے اس کے کہ ساتھ انشاء اللہ بھی کہو۔ بالفاظ دیگر یہ بھی اللہ کی مشیت سے ہی ہوتا ہے انسان اپنے زور اور سعی سے کچھ نہیں کر سکتا۔ اور طریق ادب یہی ہے کہ انسان ہر ایک معاملہ کو خود کوشش کرتا ہوا اللہ کے سپرد کرے۔ اور ایک معنی یوں کیے گئے ہیں کہ تم مت کہو سوائے اس کے کہ اللہ چاہے اور اللہ کی مشیت اس کی وحی کا نزول ہے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ تم اپنی طرف سے مت کہو کہ ہم دنیا میں یوں خدا کا نام پھیلا لیں گے۔ ہاں جو کچھ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس کے مطابق کہہ دو اور ﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ﴾ میں ہر ایک داعی الی الحق کو نصیحت کی ہے کہ اپنے رب کو بہت یاد کرے اور اپنے آپ کو غفلت کی حالت سے باہر نکالنے کی کوشش کرتا رہے۔ اور رَّبَّكَ کی خصوصیت اس لیے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت روحانی چاہتی ہے کہ اس کا نام دنیا میں پھیلے۔ اور ﴿عَسٰۤى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾﴾ میں بتایا کہ اسلام کے لیے دعوت الی الحق کے کام میں اس قدر مشکلات نہ ہوں گی جیسے عیسائیت کے رستہ میں تھیں۔ چنانچہ ابتدائی تاریخ اسلام اور ابتدائی تاریخ عیسائیت میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ عیسائیت تین سو سال تک ایک سلطنت روما کے اندر بھی بمشکل آٹھواں حصہ ساتھ ملا سکی۔ مگر اسلام تین سو سال کے عرصہ میں کل روئے زمین پر پھیل گیا۔ اور نبی کریم ﷺ کے غار میں ٹھہرنے کی طرف بھی یہاں اشارہ ہو سکتا ہے کہ آپ صرف تین دن غار میں رہے۔ حالانکہ اصحاب کہف کو کئی سال تک اس حالت میں رہنا پڑا۔ ایسا ہی اس زمانہ میں بھی اگر کوئی شخص غور کرے تو کیسا اللہ تعالیٰ کی قدرت کا نظارہ نظر آتا ہے

قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِهٖ وَ اَسْمِعْ ؕ

کہہ اللہ خوب جانتا ہے جتنا رہے۔[1910] آسمانوں اور زمین کے بھید اسی کو (معلوم) ہیں کیا خوب دیکھنے والا اور کیا خوب سننے والا ہے

کہ ایک مذہب کروڑ در کروڑ روپیہ خرچ کر کے اور ہزار ہا مبلغ بھیج کر اس قدر کامیاب نہیں ہوسکتا جس قدر دوسرا مذہب اپنی کسمپرسی کی حالت میں ترقی کر رہا ہے۔ ایک افریقہ کو دیکھو کہ عیسائیت اور اسلام کے مقابلہ ترقی میں وہاں کیسا ﴿لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا﴾ کا نظارہ نظر آ رہا ہے۔ پھر آج کسی عیسائی ملک میں ایک مشن اسلامی چلا جائے تو اس کی فتوحات ایک طرف اور کسی اسلامی ملک میں سو مسیحی مشن چلے جائیں تو ان کے نتائج کو دوسری طرف رکھ کر مقابلہ کرلو۔ گو افسوس یہ ہے کہ باوجود اس قدر اسلام کے لیے سہولت کے مسلمان اسی کام میں سب سے بڑھ کر غفلت دکھا رہے ہیں۔ چنانچہ اس مقابلہ کے بعد فوراً عیسائیت کے اس زمانہ کی طرف توجہ دلائی ہے جب وہ غاروں میں چھپ چھپ کر گزارہ کرتے تھے اور اسی مقابلہ عیسائیت و اسلام کی پچھلی حالت کا ذکر چوتھے رکوع میں ہے۔

1910 - **عیسائیت کا تین سو سال غربت کی حالت میں رہنا:** بظاہر یہ دونوں بیان، ایک یہ کہ وہ اپنی غار میں تین سو نو سال رہے اور دوسرا یہ کہ اللہ بہتر جانتا ہے کتنا رہے متضاد معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض رکیک تاویلیں بھی مفسرین نے کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ چونکہ تِسع یعنی نو کے ساتھ سال کا لفظ نہیں اور ممکن ہے نو مہینے یا نو دن یا نو گھڑیاں مراد ہوں۔ اس لیے فرمایا کہ ﴿اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا﴾ اور بڑی مشہور تاویل اس کی یہ کی ہے کہ ﴿وَ لَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ﴾ عطف ہے سَيَقُوْلُوْنَ پر اور مراد یہ ہے کہ یہ بھی دوسرے لوگوں کا قول ہے۔ اور یہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب ہے۔ اور اس میں یہ دقت ہے کہ کوئی روایت ایسی نہیں ملتی جس میں تین سو یا تین سو نو سال اصحاب کہف کا غار میں رہنا بیان کیا گیا ہو۔ اور دوسرے اس طرح قَالُوْا محذوف ماننے سے الفاظ سے امن اٹھ جاتا ہے۔ اور بعض نے یوں کہا ہے کہ ﴿اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا﴾ میں مراد وہ زمانہ ہے جو ان کی حالت پر اطلاع پانے سے لے کر رسول اللہ ﷺ کے زمانہ تک گزرا (ر) اور حق یہ ہے کہ تضاد کوئی نہیں۔ قرآن کریم کا لفظ لفظ حکمت پر مبنی ہے۔ پہلی آیت میں فرمایا کہ وہ تین سو نو سال اپنی کہف میں رہے۔ دوسری میں فِیْ كَهْفِهِمْ کا لفظ نہیں بلکہ صرف لَبِثُوْا ہے اور اس کے ساتھ ﴿لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ بڑھا کر بتا دیا کہ یہ آئندہ کے زمانہ کی خبر ہے۔ اور اصل یہ ہے کہ یہاں ان اصحاب کہف کا ذکر نہیں بلکہ خود عیسائیت کا ذکر ہے اور اس کی دو حالتوں کے متعلق فرمایا کہ ایک ان کی کہف کی حالت تھی اور ایک غلبہ کی حالت جب عیسائیت شاہی مذہب ہو کر اصل حقیقت سے بھی دور جا پڑی۔ ان کی پہلی حالت تین سو نو سال تک رہی اور دوسرے حالت کے متعلق فرمایا کہ جتنی مدت وہ رہیں گے اللہ ہی اس کو خوب جانتا ہے۔ کیونکہ یہ غیب کی بات ہے اور غیب کا جاننے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلا رہنا غیب کی حالت نہیں کہلا سکتا۔ اور پھر دوسرے رہنے کے ساتھ یہ بڑھا کر کہ اللہ کے سوائے ان کا کوئی ولی نہیں اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا، یہ بھی بتا دیا کہ آخر کار ان کے غلبہ کی صف بھی لپیٹ دی جائے گی۔

مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ٘ وَّ لَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾

اس کے سوائے کوئی ان کا حمایتی نہیں اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔(1911)

تین سونو سال اور قرآن کریم کا اعجاز اظہار علم غیب:

تین سونو سال کے متعلق غور کیا جاتا ہے تو یہ بھی قرآن کریم کے عجیب اعجازات میں سے نظر آتا ہے۔ ہمارے نبی کریم ﷺ تو اُمّی تھے اور تاریخ عیسائیت کی عرب کو کیا خبر تھی۔ جب خود عیسائیوں کو بھی ان باریک تفصیلات کا علم نہ تھا۔ قرآن کریم نے چند لوگوں کے کہف میں جانے کی غرض یہ بیان کی ہے کہ وہ خدا کے سوائے کسی دوسرے کو معبود نہ مان سکتے تھے۔ پس عیسائیت کے کہف میں رہنے کی وہ حالت ہے جب وہ ابھی اس میں تین خداؤں کا عقیدہ جو شرک ہے مروج نہیں ہوا۔ اب تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قسطنطین کے عیسائی مذہب کے علی الاعلان اختیار کرنے کے بعد 325ء میں مذہب تثلیث کو اصل عیسائیت اور شاہی مذہب قرار دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی اگر ایک طرف عیسائیت مظلومیت کی حالت سے نکل کر غالب مذہب بن گئی تو دوسری طرف اصل توحید سے یہ دور جا پڑی۔ لیکن ابھی یہ سوال باقی ہے کہ قرآن شریف نے بجائے 325 کے تین سونو سال کیوں فرمائے۔ یہیں پر قرآن کریم کے علم غیب کے سامنے انسان کو سر جھکانا پڑتا ہے۔ عیسائیت کی تاریخ میں خود چھ سال کی غلطی چلی آتی ہے۔ یعنی حضرت مسیح کی پیدائش جس سے سنہ عیسوی شروع ہوتا ہے مشہور سنہ عیسوی سے چھ سال پہلے ہوئی۔ اس لیے جسے 325 کہا جاتا ہے وہ مسیح کی پیدائش سے فی الواقع تین سوتیس یا اکتیس سال ہیں اور حضرت مسیح کا دعویٰ تاریخ عیسائیت کے مطابق تیس سال کی عمر میں ہوا۔ اس لیے دعویٰ سے لے کر تثلیث کے سرکاری طور پر عیسائی مذہب قرار پانے تک پورے تین سو سال ہوئے اور نو سال کے بڑھانے کا جو علیحدہ ذکر قرآن شریف نے کیا ہے تو اسے مفسرین نے بھی قمری حساب کا اضافہ بیان کیا ہے۔ یعنی ہر صدی میں قمری حساب سے تین سال بڑھ جاتے ہیں۔ پس پوری تین صدیاں جو عیسائیت کی حالت کہف تھی اس پر قمری حساب سے نو سال اور بڑھ گئے اور قرآن شریف نے تین سو سال کو نو سال سے الگ کر کے بتا دیا کہ عیسائیت کی اصل حالت کہف تو تین سو سال ہی رہی مگر قمری حساب سے اس میں نو سال اور بڑھ جائیں گے۔ آج دنیا میں تاریخی واقعات کے اظہار سے قرآن شریف کا حرف حرف اس طرح صحیح ثابت ہونا صاف بتاتا ہے کہ یہ خدائے عالم الغیب کا کلام ہے نہ کسی انسان کی بناوٹ۔

1911- ﴿اَبْصِرْ بِهٖ وَ اَسْمِعْ﴾ بِهٖ میں ضمیر اللہ کی طرف ہے اور یہ مدح میں مبالغہ ہے جیسے کہا جائے [مَا اَبْصَرِہٖ وَ اَسْمِعِہٖ] یعنی اللہ تعالیٰ کیسا عجیب دیکھنے والا اور کیسا عجیب سننے والا ہے کہ کوئی چیز اس سے مخفی نہیں رہتی۔ (ج)

﴿مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ﴾ یہاں ضمیر انہی عیسائیوں کی طرف جاتی ہے جن کا ذکر ابھی ہو چکا اور مطلب یہ ہے کہ جب وہ اپنے غلبہ کے وقت حد سے تجاوز کرنے لگیں گے تو انہیں معلوم ہوگا کہ اللہ کے سوائے ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا اور اللہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ یعنی جو حکومت اور بادشاہت کسی قوم کو دی جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی حکومت میں شرک کے طور پر

وَ اتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾

اور پڑھ جو تیرے رب کی کتاب سے تیری طرف وحی کی گئی ہے۔کوئی اس کی باتوں کو بدلنے والا نہیں۔اور اس کے سوائے تو کہیں پناہ نہیں پائے گا۔[1912]

وَ اصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَ لَا تَعْدُ عَیْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِیْدُ زِیْنَةَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾

اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روک رکھ جو صبح اور شام اپنے رب کو پکارتے ہیں (اور) اسی کی رضا کو چاہتے ہیں۔اور اپنی نگاہیں ان سے ہٹا کر (اور طرف) نہ دوڑا (کہ) تو دنیا کی زندگی کی آرائش کا ارادہ کرے اور اس کی بات نہ مان جس کا دل ہم نے اپنے ذکر سے غافل رکھا ہے اور وہ اپنی خواہشات کی پیروی کرتا ہے اور اس کا معاملہ حد سے گزرا ہوا ہے۔[1913]

الثلاثة

نہیں کہ وہ اپنی قوت سے اسے قائم رکھ سکیں۔بلکہ مصالح الٰہی کے ماتحت وہ حکومت دی جاتی ہے اور اصل حکم اللہ کا ہی ہے۔اس لیے جب وہ چاہتا ہے حکومت بھی لے لیتا ہے اور اس کے یہ معنی نہیں کہ اور کسی کو حکومت دیتا ہی نہیں۔بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ حکومت میں اس کے شریک نہیں بلکہ اس کے ماتحت ہیں۔

1912 - ﴿مُلْتَحَدًا﴾۔لَحْدٌ وہ گڑھا ہے جو وسط سے ایک جانب مائل ہو۔اِلْحَادٌ کے لیے[دیکھو نمبر: 1181 ،1786] اور اِلْتَحَدَ کے معنی ہیں ایک چیز کی طرف مائل ہوا۔پس مُلْتَحَدٌ سے مراد پناہ یا جائے پناہ ہے۔(غ)

یہاں تلاوت کتاب کا حکم دے کر صاف بتا دیا کہ تم لوگوں کو حق کی طرف بلاؤ کیوں کہ یہ کتاب تیرے رب کی طرف سے یعنی لوگوں کی ربوبیت روحانی کے لیے نازل ہوئی ہے اور ﴿لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ﴾ میں بتایا کہ حق کی آخری کامیابی کی پیشگوئی ٹل نہیں سکتی اور سب پناہیں جو عارضی طور پر انسان اپنے لیے تلاش کرتے رہیں گے آخر دور ہو کر صرف ایک اللہ کی پناہ ہی رہ جائے گی۔

1913 - وَجْہَ کے لیے[دیکھو نمبر: 144 ،181] وغیرہ۔وَجْہَ کا لفظ جب اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف ہو تو اس سے مراد مجازاً اللہ تعالیٰ کی رضا ہوتی ہے کیونکہ جو شخص کسی پر راضی ہو وہ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔(ر)

تَعْدُ۔عَدْوٌ کے اصل معنی تجاوز ہیں۔(غ) اور[عَدَوْتُهُ عَنِ الْاَمْرِ] کے معنی[صَرَفْتُهُ عَنْهُ] ہیں یعنی اسے اس امر

وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ؕ وَ اِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِى الْوُجُوْهَ ؕ بِئْسَ الشَّرَابُ ؕ وَ سَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۲۹﴾

اور کہہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے سو جو کوئی چاہے ایمان لائے اور جو کوئی چاہے انکار کرے۔ ہم نے ظالموں کے لیے آگ تیار کی ہے جس کی قناتیں ان کو گھیر لیں گی اور اگر پانی مانگیں گے تو انہیں تلچھٹ جیسا پانی دیا جائے گا جو ان کے مونہوں کو جلا دے گا۔ کیا ہی برا پانی ہوگا اور جائے آرام بھی بری ہوگی۔ (1914)

سے پھیر دیا۔ (ل)

فُرُطًا۔ فَرَطَ کے لیے [دیکھو نمبر: 931] اور فُرُطًا سے مراد ہے اسراف اور تضییع یعنی ضائع کر دینا (غ) اسی معنی کی تائید ابن جریر نے کی ہے۔ یہاں بھی عیسائیت اور اسلام کا مقابلہ کیا ہے۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو صبح و شام یعنی اپنے تمام اوقات میں اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں اور صرف اللہ کی رضا کو چاہتے ہیں اور دوسری طرف وہ ہیں جو دنیا کی آرائشوں کے پیچھے اس قدر پڑے ہیں کہ اللہ کے ذکر سے ان کے دل بالکل غافل ہو گئے ہیں اور اپنی حرص و ہوا کی پیروی میں لگے ہوئے ہیں۔ تو رسول کو یا ہر داعی الی الحق کو حکم ہوتا ہے کہ اللہ کی رضا ہی وہ چیز ہے جس کی طرف تمہاری نظر اٹھنی چاہیے اور زیب و زینت دنیوی تمہاری نظر کو نہ کھینچ لے۔

1914- سُرَادِقُ۔ قنات کو کہتے ہیں جو خیمہ کو گھیرے ہوئے ہوتی ہے۔ یا دیوار جو کسی چیز کو گھیر لے اس کی جمع سرادقات آتی ہے۔ (ل)

مُهْلِ۔ مَهْلِ آہستگی یا ٹھہر جانا ہے یعنی مہلت ﴿فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝﴾ [الطارق: 17:86] ''پس تو کافروں کو مہلت دے اور انہیں تھوڑی ہی مہلت دے۔'' اور مُهْلِ تلچھٹ کو بھی کہتے ہیں۔ (غ) اور یہ معنی حدیث مرفوع میں نبی کریم ﷺ سے مروی ہیں۔ (ر) اور پگھلے ہوئے تانبے وغیرہ کو بھی کہتے ہیں جس کی گرمی انتہا کو پہنچ گئی ہو۔ (ج)

﴿يَشْوِى﴾۔ [شَوَى اللَّحْمَ] کے معنی ہیں بھونا گوشت۔ اور شَوَى اطراف کو کہتے ہیں جیسے ہاتھ اور پیر ﴿نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى﴾ [المعارج: 16:70] ''ہاتھ پاؤں کو کھا جانے والی۔'' (غ)

مُرْتَفَقًا۔ رِفْقٌ اور مِرْفَقٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 793] اور اِرْتَفَقَ کے معنی ہیں کہنی پر ٹیک لگائی۔ (ل) اس لیے مراد آرام یا استراحت ہے اور یہاں اس کا استعمال اس لحاظ سے ہے کہ آرام اور استراحت کی جگہ بھی ان کے لیے آگ ہے۔

اس آیت میں صاف بتا دیا کہ یہ وہ حق ہے جو ان لوگوں کو پیش کیا جاتا ہے ﴿اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ﴾ ایمان لانا یا انکار کرنا ہر شخص کا اپنا اختیار ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ ایمان پر مجبور کرتا ہے نہ انکار پر۔ پھر جیسے ان کے اعمال ہیں ویسی سزا ہے۔ جس طرح حرص دنیا نے

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ۚ﴿۳۰﴾

جولوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے رہے (تو) ہم اس کا اجر ضائع نہیں کرتے جو اچھا عمل کرتا ہے۔

اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ یَلْبَسُوْنَ ثِیَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕیْنَ فِیْهَا عَلَى الْاَرَآىِٕكِ ؕ نِعْمَ الثَّوَابُ ؕ وَ حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۳۱﴾ ع 4 9 16

ان کے لیے ہمیشگی کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان میں انہیں سونے کے کڑے پہنائے جائیں گے اور وہ باریک اور موٹے ریشم کے سبز کپڑے پہنیں گے، ان کے اندر تختوں پر تکیے لگائے ہوئے ہوں گے، کیا ہی اچھا بدلہ ہے اور جائے آرام بھی اچھی ہوگی۔ (1915)

یہاں چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا وہی آگ بن کر وہاں گھیر لے گی اور جس طرح دنیا کی محبت کی پیاس یہاں نہیں بجھتی وہاں بھی اس کے بجھنے کا سامان کوئی نہ ہوگا۔

1915 - ﴿اَسَاوِرَ﴾ اور اَسْوِرَةٌ سوار کی جمع ہے ﴿اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ﴾ [الزخرف: 53:43] ''سونے کے کڑے۔'' [دیکھو نمبر: 37]

﴿سُنْدُسٍ﴾۔ باریک ریشم کو کہتے ہیں اور اِسْتَبْرَقٍ موٹے ریشم کو (ل)

اَرَآئِكِ۔ اَرِیْكَةٌ کی جمع ہے اَرَكَ کے معنی ایک مکان میں ٹھہرا اور اَرَاكَ خاص درخت ہے اور اَرِیْكَةٌ کے معنی ہیں [حَجْلَةٌ عَلٰی سَرِیْرٍ] یعنی تخت یا پلنگ جس پر چھپر کھٹ لگی ہوئی ہو۔ (غ)

سونے کے کڑوں، ریشمی لباس، تختوں سے مراد:

نعمائے جنت کے متعلق یہ تو بارہا بیان ہو چکا ہے کہ وہ [مَا لَا عَیْنٌ رَأَتْ] کی مصداق ہیں اور یہ جو نام لیے جاتے ہیں تو یہ مراد نہیں کہ یہ اس دنیا کی چیزیں وہاں ہوں گی۔ کیونکہ اس دنیا کی سندس اور استبرق اور سونے کے کڑے وہ چیزیں ہیں جو آنکھیں دیکھتی ہیں یا کان سنتے ہیں مگر جنت کی چیزیں بروئے حدیث صحیح ایسی ہیں کہ دل میں بھی ان کا خیال نہیں گزرا۔ اور اس سے یہ خیال کر لینا کہ اس طرح ان چیزوں کے وجود کا ہی انکار ہو گیا کم فہمی ہے۔ اصل میں ان اسماء سے اس بات کو ظاہر کرنا مقصود ہے جو ان چیزوں سے یہاں مقصود ہوتی ہے۔ سونے کے کڑے، تختوں پر بیٹھنا، فاخرہ لباس یہ سب زینت کی چیزیں اور سرداری کے نشان ہیں اور چونکہ یہاں عیسائی اقوام کے بالمقابل مومنین کے لیے نعماء کا ذکر تھا اس لیے خاص ان نعماء کا ذکر کیا ہے جس کی مالک اس دنیا میں یہ قومیں اپنے آپ کو سمجھتی ہیں۔ اور مراد یہ ہے کہ حقیقی سرداری انہی لوگوں کی ہے جو رضائے الٰہی

وَ اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّ حَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّ جَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿۳۲﴾

اور ان کے لیے دو شخصوں کی مثال بیان کر جن میں سے ایک کے لیے ہم نے انگوروں کے دو باغ بنائے اور ان کے گرد اگرد کھجوریں لگائیں اور ان دونوں کے درمیان کھیتی لگائی۔ (1916)

کے طالب ہیں اور اس دنیا کی سرداری جلدی ختم ہو جاتی ہے اور ان کے لباس کو سبز کہا ہے۔ اس لیے کہ سبز رنگ سے دیکھنے والوں کی آنکھوں کو راحت پہنچتی ہے۔ اسی لیے شہداء کی ارواح کے ذکر میں ہے کہ وہ جنت میں [فِی حَوَاصِلَ طُیُوْرَ خُضْرٍ] [صحیح بخاری البغا، کتاب الجهاد والسیر، باب فضل قول الله تعالی] یا [فِي صُوَرِ طَيْرٍ خُضْرٍ] [شعب الایمان، باب فی الصبر علی المصائب، جلد12، صفحہ176، حدیث: 9237] یعنی سبز پرندوں کی چونچ دان میں یا سبز پرندوں کی صورت میں ہیں۔ تو دونوں صورتوں میں ایک ہی حقیقت کا انکشاف ہے۔ ہاں یہ بھی سچ ہے کہ ان نعمائے جنت کے ذکر میں فتوحات دنیوی کی طرف بھی ایک لطیف اشارہ ہے۔ اور اس کا پتہ ہمیں خود نبی کریم ﷺ کی زبان سے لگتا ہے۔ جب آپ ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ کی طرف جا رہے تھے اور صرف سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے تو ایک شخص سراقہ نامی نے آپ کا تعاقب کیا۔ مگر آخر اس پر بعض نشانات سے آپ کی سچائی کا اثر ہوا۔ تو مخلصانہ حاضر خدمت ہوا اور معافی کا خواستگار ہوا۔ اس وقت نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے سراقہ میں تیرے ہاتھوں میں کسریٰ کے سونے کے کنگن دیکھتا ہوں۔ چنانچہ یہ خبر جو اس قدر بے سروسامانی کی حالت میں دی گئی تھی کہ ایران کے خزانے مسلمانوں کے قبضہ میں آئیں گے۔ جب خود اپنی جان بھی سخت خطرہ کی حالت میں تھی، چوبیس سال بعد پوری ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے ان وعدوں میں فتوحات دنیوی کی طرف بھی لطیف اشارہ موجود ہے۔

1916- حَفَفْنٰهُمَا۔ [حَفَّ بِالشَّيْءِ] کے معنی ہیں ایک چیز کے گرد گرد گھوما یا اس کا احاطہ کیا ﴿وَ تَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ﴾ [الزمر: 75:39] ''اور تو فرشتوں کو دیکھے گا عرش کے اردگرد حلقہ باندھے ہوئے ہیں۔'' (ل) یہاں اللہ تعالیٰ نے کافروں اور مومنوں کی ایک مثال بیان فرمائی ہے [وَضَرَبَ الْمِثْلَ لَا يَقْتَضِيْ وَجُوْدِهَا] (ر) اور جس چیز کی مثال دی جائے اس کا وجود ضروری نہیں ہوتا۔ یعنی یہ مطلب نہیں کہ فی الحقیقت کوئی ایسے دو آدمی تھے۔ مگر بعض مفسرین نے یہاں بھی نام لے کر قصہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ مطلب صرف اس قدر ہے کہ عیسائیوں کو جو مال و دولت ہم نے دیا ہے تو اس کی مثال یوں ہے اور باغوں سے مثال اس لیے دی کہ دنیا میں یہ راحت کا بڑا بھاری سامان ہے۔ ان باغوں میں بہترین پھل انگور کا ذکر کیا اور گرد اگرد کھجور کا لگانا اس کی خوبصورتی کے لحاظ سے ہے کہ وہ بوجہ اپنی لمبائی اور سیدھا ہونے کے اعلیٰ درجہ کی زینت کا سامان ہے اور پھر صرف پھلدار درخت ہی نہیں بلکہ درمیان میں غلہ کے لہلہاتے کھیت ہیں۔ اور اگلی آیت میں ہے کہ نہریں اس میں بہتی ہیں۔ اور ظاہری طور پر بھی ان قوموں نے جنگلوں کو باغ بنا دیا ہے۔

كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَ لَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۙ﴿۳۳﴾

یہ دونوں باغ اپنے پھل دیتے تھے اور اس میں کوئی کمی نہ کرتے تھے اور ان دونوں کے درمیان ہم نے نہر بہائی تھی۔

وَّ كَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾

اور اس کے پاس طرح طرح کا مال تھا تو اس نے اپنے ساتھی کو کہا اور وہ اس سے باتیں کر رہا تھا میں مال میں تجھ سے بڑھ کر ہوں اور جتھے کے لحاظ سے غالب تر ہوں۔ (1917)

وَ دَخَلَ جَنَّتَهٗ وَ هُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ۙ﴿۳۵﴾

اور وہ اپنے باغ میں داخل ہوا اور وہ اپنے آپ پر ظلم کرنے والا تھا۔ کہنے لگا میں یقین نہیں کرتا کہ یہ کبھی برباد ہوگا۔ (1918)

کفار کی زینت کے سامانوں کی نسبت اللہ کی طرف:

اور اللہ تعالیٰ نے باغ کے دینے، کھجوریں لگانے، نہریں بہانے سب باتوں کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ حالانکہ کفار نے انہیں اپنے لیے بنایا ہے اس لیے کہ سامان تو اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کیے ہیں۔

1917 - ثَمَرٌ۔ اصل میں تو درختوں کے پھل کو کہا جاتا ہے واحد ثَمَرَةٌ ہے اور جمع ثَمَرَاتٌ اور اَثْمَارٌ۔ ﴿فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ﴾ [البقرة: 22:2] ''پھر اس کے ساتھ تمہارے لیے پھلوں سے رزق نکالا۔'' ﴿كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖۤ﴾ [الأنعام: 141:6] ''اس کے پھل سے کھاؤ۔'' اور پھر ہر چیز سے جو نفع حاصل ہو اس کو اس کا ثَمَرَةٌ کہا جاتا ہے جیسے ثَمْرَةُ الْعِلْمِ-ثَمْرَةُ الْعَمَلِ اور ثمر سے مراد مال بھی لیا جاتا ہے جس سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اور یہی معنی یہاں کیے گئے ہیں۔ (غ) اور انواع المال یعنی قسم قسم کے مال۔ (قاموس) اور سونا اور چاندی۔ (ج) بھی یہاں معنی لیے گئے ہیں۔

حالانکہ اوپر صرف باغ کا ذکر تھا مگر یہ سمجھانے کو کہ یہ محض بطور مثال بیان کیا ہے یہاں اس باغ والے کے منہ سے جو لفظ کہلوائے ہیں یہ ہیں کہ میرا مال اور میرا جتھا تم سے بڑھ کر ہے اور اس جتھے کی وجہ سے اپنے غلبہ کو بھی ظاہر کیا ہے۔ مال اور جتھے پر ہی عیسائیت کو فخر ہے۔

1918 - ﴿تَبِيْدَ﴾ - بَادَ (یَبِیْدَ) کے معنی ہیں ایک چیز پراگندہ ہوگئی اور بَیْدَاءٌ بیابان کو کہتے ہیں۔ (غ)

عیسائی اقوام کی روحانیت سے محرومی:

جنت میں داخل ہونے سے مراد ایک خاص وقت میں داخل ہونا نہیں بلکہ مراد اپنے مال و متاع سے فائدہ اٹھانا ہے۔ وَهُوَ ظَالِمٌ

وَّ مَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّ لَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّیْ لَاَجِدَنَّ خَیْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿۳۶﴾

اور میں یقین نہیں کرتا کہ قیامت آئے گی اور اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹایا بھی جاؤں تو یقیناً لوٹنے کی جگہ اس سے بہتر پاؤں گا۔

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَ هُوَ یُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ بِالَّذِیْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ﴿۳۷﴾

اس کے ساتھی نے اسے کہا اور وہ اس سے باتیں کر رہا تھا کیا تو اس کا انکار کرتا ہے جس نے تجھے (پہلے) مٹی سے پیدا کیا پھر نطفہ سے پھر تجھے پورا انسان بنایا۔

لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّیْ وَ لَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّیْۤ اَحَدًا ﴿۳۸﴾

لیکن میں (جانتا ہوں کہ) وہی اللہ میرا رب ہے اور میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ (1919)

میں بتایا کہ ان سامانوں میں ایسے منہمک ہوئے کہ اپنے آپ پر ہی ظلم کرنے لگے کیونکہ اخلاق اور روحانیت کی طرف سے لاپرواہی اختیار کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا اور اصل غرض زندگی مال و دولت کو سمجھ لیا اور اس کے لیے اتنا زور لگایا کہ یہ یقین ہو گیا کہ اب دنیوی جاہ و حشم ہمارے ہاتھوں سے نہیں جا سکتا۔ یہی حالت آج عیسائیت کی ہے۔ اور اگلی آیت میں بتایا کہ آخرت پر ان کا یقین بالکل نہیں رہے گا۔ سو یہ بھی سچ ہے کہ آج عیسائی اقوام کو نہ آخرت پر یقین ہے، نہ آخرت کا کچھ فکر ہے۔ ہاں چونکہ انجیل میں قیامت کا ذکر ہے اس لیے یہ فرض کر رکھا ہے کہ آخرت کی نعمتوں کے بھی ہم ہی مستحق ہیں۔

1919 - لٰكِنَّا۠۔ اصل میں [لٰكِنْ اَنَا] ہے اور مطلب ہے [لٰكِنْ اَنَا اَقُوْلُ] لیکن میں یہ کہتا ہوں یا مانتا ہوں۔

یہاں مومن کی حالت کو بیان کیا ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ عیسائیت کے بالمقابل اسلام کی حالت کو ﴿وَ لَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّیْۤ اَحَدًا﴾ توحید کامل صرف اسلام میں ہی ہے۔ اور اس سے پہلی آیت میں جو اللہ تعالیٰ کے کفر کا ذکر ہے تو یہ بھی سچ ہے کہ عملاً عیسائی اقوام خدا کا انکار ہی کر رہی ہیں۔ یہاں تک کہ کسی معاملہ میں خدا کا نام تک لینا معیوب سمجھتی ہیں اور یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس قدرت کا انکار کرتے ہیں کہ وہ جس نے انسان کو ایسا ظاہری کمال عطا فرمایا ہے وہ اس کو کمال روحانی کے لیے بھی اٹھائے گا۔ اسی آیت میں انسان کی پیدائش کے ذکر میں فرمایا کہ تجھے مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے۔ تو مطلب یہ نہیں کہ تمہارے باپ آدم کو مٹی سے پیدا کیا اور تمہیں نطفہ سے۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ مٹی سے نباتات اور غلے پیدا ہوتے ہیں جن سے انسان کو غذا ملتی اور اس کا خلاصہ نطفہ بنتا ہے۔ تو یوں ہر ایک انسان مٹی سے ہی پیدا ہوتا ہے اور پھر مٹی سے نطفہ کی صورت میں آتا ہے۔ گویا اجزائے انسانی مٹی میں ہی ہوتے ہیں۔ وہاں سے خلاصہ ہو کر نطفہ کی صورت میں آتے ہیں۔

وَ لَوْ لَاۤ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّ وَلَدًا ﴿۳۹﴾

اور جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا کیوں نہ تو نے کہا جو اللہ چاہتا ہے (وہی ہوتا ہے) اللہ کے سوائے کوئی بھی قوت نہیں۔ اگر تو مال اور اولاد میں مجھے اپنے سے کمتر سمجھتا ہے۔ (1920)

فَعَسٰى رَبِّیْۤ اَنْ یُّؤْتِیَنِ خَیْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَ یُرْسِلَ عَلَیْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِیْدًا زَلَقًا ﴿۴۰﴾

سو امید ہے کہ میرا رب مجھے تیرے باغ سے بہتر عطا فرمائے اور اس پر آسمان سے بلا بھیجے تو وہ خالی زمین چٹیل میدان رہ جائے۔ (1921)

دوسری زندگی کے مدارج اس زندگی کی طرح ہیں:

اسی طرح پر ﴿نَشْاَةَ الْاٰخِرَةَ﴾ [العنکبوت 29:20] ''آخرت کا اٹھانا'' یا دوسری زندگی ہے کہ انسان کے اعمال متفرق اور پراگندہ ہوتے ہیں۔ ان کے نتائج کے ساتھ ساتھ ظہور پذیر ہونے سے ایک خلاصہ انسان کی دوسری زندگی کا بنتا جاتا ہے جس کو نطفہ سے مشابہت ہے یعنی زندگی تو وہ یہاں بھی موجود ہے لیکن نطفہ کے طور پر ایک نامعلوم صورت میں ہے۔ پھر عالم برزخ گویا اس حالت سے مشابہ ہے جب بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے اور قیامت اس کی پیدائش کا وقت ہے۔

1920 - ﴿مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾ یعنی [اَلْاَمْرُ مَاشَاءَ اللّٰہِ] یا [مَاشَاءَ اللّٰهُ كَانَ] کیوں کہ اگر اللہ تعالیٰ ان چیزوں کو ہی پیدا نہ کرتا جن سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے تو یہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ انسان تب ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے جب اللہ تعالیٰ اسے پہنچانا چاہتا ہے۔ اور وہ فائدہ پہنچانا سامانوں کی پیدائش سے ہے ﴿لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾ میں عجز انسانی کا اعتراف ہے اور حدیث میں اس قول کو جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ فرمایا ہے۔

اِنْ تَرَنِ۔ تَرَنِ اصل میں تَرَئِنِ ہے اور انا فعل کے لیے ہے اور اول مفعول ثانی اور جواب شرط محذوف ہے۔ جس کے قائم مقام اگلی آیت ہے۔

1921 - حُسْبَانَ کے اصل معنی حساب ہی ہیں اور یہاں مراد آسمان سے آگ یا عذاب ہے اور وہ حقیقت میں وہ ہے جس پر حساب لیا جائے۔ پس اس کے مطابق جزا دی جائے۔ (غ)

زَلَقٌ اور زَلَلٌ ایک ہی ہیں اور زَلَقٌ وہ زمین ہے جس پر پاؤں نہ جمے یعنی پھسلنی زمین۔ اس لیے زَلَقٌ سے مراد یہاں ایسی زمین ہے جس میں سبزی نہ ہو اور دوسری جگہ ہے ﴿لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ﴾ [القلم: 51:68] یعنی اپنی نظروں سے (یا گھور گھور کر) تجھے اپنے مقام سے جس پر اللہ تعالیٰ نے تجھے کھڑا کیا ہے ہٹا دیں۔ (ل)

اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ۝٤١
یا اس کا پانی اتر جائے پھر تو اسے نکال نہ سکے۔

وَ اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ۝٤٢
اور اس کا مال و دولت تباہ کر دیا گیا تو اس پر اپنے ہاتھ ملنے لگا جو اس پر خرچ کیا تھا اور وہ ویران تھا اپنی چھتوں پر گرا ہوا اور کہنے لگا اے کاش! میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا۔(1922)

وَ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ مَا كَانَ مُنْتَصِرًا ۝٤٣
اور اس کے لیے کوئی جتھا نہ تھا جو اللہ کے سوائے اس کی مدد کرتا اور نہ ہی وہ خود اپنی مدد کر سکا۔(1923)

هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ؕ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ عُقْبًا ۝٤٤ ع 5/12/17
وہاں اختیار اللہ کے لیے ہے جو حق ہے، وہی بدلہ دینے میں اچھا اور اچھا انجام لانے میں بہتر ہے۔(1924)

بہتر باغ سے مراد وہی جنت آخرت ہے جس کا مومنوں کے لیے وعدہ ہے جو کبھی فنا نہیں ہوگی۔ اس دنیا کے مال پر فنا بھی آ جاتی ہے، طاقت وحشمت، دولت سب کچھ جاتا رہتا ہے جس کے لیے کوئی آسمانی اسباب پیدا ہوجاتے ہیں ﴿مِّنَ السَّمَآءِ﴾ یا زمینی جیسا اگلی آیت میں ہے کہ پانی خشک ہوجائے۔

1922 - ﴿يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ﴾ کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ ہاتھوں کو الٹا سیدھا کرتا یا ایک ہاتھ کی ہتھیلی دوسرے کی پشت پر رکھتا۔ پھر اس کے برعکس مطلب اظہار ندامت ہے جسے ہماری زبان میں ہاتھ ملنا کہتے ہیں۔

مال دنیا تو ہاتھ سے نکلتا ہی رہتا ہے۔ تب ہی انسان کو سمجھ آتی ہے کہ خدا سے تعلق ہی وہ چیز ہے جو ہر حال میں انسان کے کام آتا ہے۔ فی الحقیقت یہی وہ جنت ہے جس سے انسان کبھی نکالا نہیں جاتا۔

1923 - مُنْتَصِر۔ اِنْتِصَارٌ اور اِسْتِنْصَارٌ کے معنی ہیں مدد طلب کرنا۔ (غ)

1924 - وَلَايَةٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 332] مگر ابن جریر کہتے ہیں کہ وَلَايَةٌ کے معنی موالات ہیں اور وِلَايَةٌ کے حکومت اور غلبہ۔ اور عُقِبٌ اچھا انجام ہے [دیکھو نمبر: 1614]۔ مطلب یہ ہے کہ اسی مقام پر آ کر معلوم ہوتا ہے کہ نصرت اللہ کی طرف سے ہی ملتی

وَ اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِیْمًا تَذْرُوْهُ الرِّیٰحُ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۴۵﴾

اوران کے لیے دنیا کی زندگی کی مثال بیان کر (اس کی مثال) پانی کی طرح ہے جو ہم بادل سے برساتے ہیں تو اس کے ساتھ زمین کی روئیدگی (بڑھ کر) مل جاتی ہے پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے جسے ہوائیں اڑائے پھرتی ہیں اور اللہ ہر چیز پر پوری پوری قدرت رکھتا ہے۔ (1925)

اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِیْنَةُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَ الْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَیْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾

مال اور بیٹے دنیا کی زندگی کی زینت ہے اور باقی رہنے والے اچھے عمل تیرے رب کے نزدیک بدلے میں بہتر ہیں اور امید کے لحاظ سے (بھی) بہت اچھے ہیں۔ (1926)

ہے۔ کیونکہ دنیا دار طاقتور آخر اپنی طاقت کو ہلاکت سے نہیں بچا سکتے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ سے ہی ولایت یا دوستی کا تعلق کام آتا ہے۔

1925 - هَشِیْمٌ۔ هَشْمٌ نرم چیز جیسے نبات کے (غ) یا ایسی چیز کے توڑنے پر بولا جاتا ہے جو اندر سے خالی اور خشک ہو (ل) اس لیے ہڈیوں وغیرہ کے توڑنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور هَشِیْمٌ پتے وغیرہ ہیں جو خشک ہو کر ٹوٹ جائیں اور چورا چورا ہو جائیں ﴿فَكَانُوْا كَهَشِیْمِ الْمُحْتَظِرِ﴾ [القمر: 31:54] ''سو وہ باڑ لگانے والے کی روندی ہوئی باڑ کی طرح چورا ہو گئے۔''

﴿تَذْرُوْهُ﴾۔ ذَرْوٌ ہوا کے مٹی وغیرہ اڑا کر لے جانے پر بولا جاتا ہے ﴿وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا ۙ﴾ [الذاریات: 1:51] ''گواہ ہیں اڑا کر پھیلا دینے والیاں۔'' (ل)

مُقْتَدِر کے معنی وہی ہیں جو قَدِیْرٌ کے ہیں لیکن یہ ابلغ ہے۔ (ل) مُقْتَدِرٌ بشر پر بھی بولا جاتا ہے اور مراد ہوتی ہے اکتساب سے قدرت حاصل کرنے والا۔ (غ)

دنیوی زیب وزینت چلی جانے والی چیز ہے:

کیا پُرحکمت کلام ہے۔ چونکہ عیسائی اقوام کو حیات دنیا کی زیب وزینت پر ہی سارا فخر ہے اس لیے یہاں اس کی حقیقت بھی بتادی اور فرمایا کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی چیز ہے۔ مگر یہ سبزی کی طرح ہے ایک وقت کیسی خوشنما ہوتی اور لہلہاتی ہے دوسرا وقت ہوتا ہے خشک ہو کر چورا چورا ہو جاتی ہے۔ یہی حالت قوموں کی زندگی کی ہے کہ ایک وقت ایک قوم زیب وزینت دنیوی کے لحاظ سے کمال کو پہنچی ہوئی ہوتی ہے۔ دوسرا وقت آتا ہے اس کا نام نشان بھی نہیں ملتا۔ ﴿عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ مُّقْتَدِرًا﴾ میں اسی طرح اشارہ ہے۔

1926 - اَمَلَ اور اَمِلَ کے معنی ہیں آخری امید اور جمع اٰمَالٌ ہے۔ (ل)

وَ یَوْمَ نُسَیِّرُ الْجِبَالَ وَ تَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّ حَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ﴿۴۷﴾

اور جس دن ہم پہاڑوں کو دور کر دیں گے اور تو زمین کو کھلا میدان دیکھے گا اور ہم انہیں اکٹھا کریں گے سو ان میں سے کسی کو پیچھے نہیں چھوڑیں گے۔ (1927)

اعمال حسنہ کا بقاء:

دنیوی زیب و زینت کے مقابل پر اس اصلی سامان زینت کا ذکر کیا جو کبھی برباد نہیں ہوتا اور اسی لیے اس کو باقیات کہا جس کے لیے [دیکھو نمبر: 317] وہ اعمال جن کا مقصد حصول رضائے الٰہی ہو یہی ایک چیز ہے جو ہمیشہ کے لیے باقی رہتی ہے کیونکہ جزا اسی پر ملتی ہے۔ ﴿وَ مَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤى ﴿۱۹﴾ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ﴿۲۰﴾ وَ لَسَوْفَ یَرْضٰى ﴿۲۱﴾﴾ [اللیل: 92:19-21] ''اور اس کے ذمے کسی کا احسان نہیں جس کا بدلہ دیا جائے۔ مگر اسے صرف اپنے رب بلند تر کی رضا منظور ہے۔ اور وہ جلد خوش ہو جائے گا۔'' اور حدیثوں میں جو [اَلْبَاقِیَاتُ الصَّالِحَاتُ] کی تفسیر میں بعض کلمات آئے ہیں جیسے سُبْحٰنَ اللّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تو مراد یہی ہے کہ وہ بھی [اَلْبَاقِیَاتُ الصَّالِحَاتُ] میں داخل ہیں

1927- ﴿نُسَیِّرُ﴾۔ سَارَ کے معنی ہیں چلا اور [سَیَّرَهُ مِنْ بَلَدِهٖ] کے معنی ہیں اسے اس کے شہر سے نکال دیا اور جلاوطن کر دیا اور [سَیَّرْتُ الْجُلَّ عَنْ ظَهْرِ الدَّابَّةِ] میں نے چارپائے کی پیٹھ سے جھول کو دور کر دیا۔ (ل) اور سَیَّرْتُهٗ میں کثرت پائی جاتی ہے اور نَسِیْرٌ میں بعض وقت چلنے والے کا ارادہ اور اختیار ہوتا ہے ﴿هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُكُمْ﴾ [یونس: 10:22] ''وہی ہے جو تمہیں چلاتا ہے۔'' اور بعض وقت قہر اور غلبہ سے چلانا ہوتا ہے جیسے یہاں۔ (غ)

بَارِزَةً۔ بَرَزٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 320] اور بَارِزَةً گویا زمین خود کھلا میدان بن جائے گی جس میں کوئی روک باقی نہ رہے گی اور چونکہ بَرَزٌ بعض وقت چھپی ہوئی حالت کے ظاہر ہونے پر بھی بولا جاتا ہے اس لیے بَارِزَةً سے مراد بھی اسی کے مطابق ہو سکتی ہے جیسے فرمایا ﴿یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ﴾ [ابراھیم: 14:48] ''جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی۔''

نُغَادِرْ۔ غَدْرٌ کے معنی کسی چیز کا چھوڑ دینا اور ترک کر دینا ہیں۔ اس لیے ترک عہد پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور غَدِیْرٌ وہ پانی ہے جسے سیلاب ایسی جگہ میں چھوڑ دے جہاں پانی جمع ہو جاتا ہے اور غَادِرٌ کے معنی بھی چھوڑ دیا ہیں۔

اس آیت میں اور اس سے اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کا ذکر فرمایا ہے جہاں یہ دنیا کا مال کچھ کام نہیں دے گا۔ مگر قیامت کے متعلق جس قدر الفاظ استعمال کیے ہیں وہ عموماً مجازی رنگ میں قیامت وسطی یعنی ایک قوم کی تباہی پر بھی صادق آتے ہیں۔

وَ عُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ؕ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۭ ۬ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿۴۸﴾

اور وہ تیرے رب کے سامنے صف باندھ کر پیش کیے جائیں گے۔ یقیناً تم ہمارے پاس آ جاؤ گے جس طرح ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا بلکہ تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہارے لیے وعدے کے پورا ہونے کا کوئی وقت مقرر نہیں کیا۔ (1928)

وَ وُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَ يَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً اِلَّاۤ اَحْصٰىهَا ۚ وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَ لَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾ ع 6 5 18

اور کتاب رکھی جائے گی تو تُو مجرموں کو اس سے جو اس میں ہے ڈرتے ہوئے دیکھے گا اور وہ کہیں گے اے ہم پر افسوس! یہ کیسی کتاب ہے کہ نہ چھوٹی بات کو پیچھے چھوڑتی ہے اور نہ بڑی کو مگر اسے محفوظ کر لیا ہے، اور جو کچھ انہوں نے کیا تھا موجود پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ (1929)

1928- ﴿عُرِضُوْا﴾۔[عَرَضْتُ عَلَيْهِ] کے معنی ہیں اس کے لیے ظاہر کیا۔(ل) صَفًّا۔ صَفَّ کے معنی ہیں چیزوں کو ایک خط مستقیم پر رکھنا۔ اپنے رب کے سامنے صف باندھ کر پیش کیا جانے سے کیا مراد ہے؟ حدیث میں بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اولین اور آخرین کو ایک ہی مقام پر صفیں باندھ کر کھڑا کرے گا۔ مراد اس سے ایک ہی صف میں سب کا کھڑا کرنا بھی ہوسکتا ہے۔ یعنی سب کا یکساں حالت میں اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہونا اور یہ بھی مراد ہوسکتا ہے کہ الگ الگ امتیں الگ الگ صفوں میں کھڑی کی جائیں گی اور بعض نے کہا کہ یہ کلام استعارہ کے رنگ میں ہے اور مشہور معنی میں پیش ہونا یا صفیں باندھنا مراد نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا ان کے بارہ میں حکم صادر کرنا ہے۔(ر)

﴿لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا﴾ یا قول کے طور پر ہے یعنی ہم کہیں گے یا انہیں کہا جائے گا اور یا ماضی کا استعمال استقبال کے لیے تحقق وقوع فعل کے لیے ہے۔ یعنی ضرور تمہاری دوسری پیدائش اسی طرح حق ہے جس طرح یہ پہلی پیدائش حق ہے۔ میرے نزدیک اسی کو ترجیح ہے۔ اور مَوْعِدُ جو وَعْدٌ سے اسم زمان ہے اس میں اشارہ اس وعدہ کی طرف ہے جو دوسری پیدائش سے تعلق رکھتا ہے اور مصدر میمی بمعنی وعدہ بھی ہے۔

1929- ﴿وُضِعَ الْكِتٰبُ﴾ وَضَعَ کے معنی رکھنا ہیں اور ﴿وُضِعَ الْكِتٰبُ﴾ سے مراد ہے بندوں کے اعمال کا ظاہر کرنا۔ جس طرح فرمایا ﴿وَ نُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴿۱۳﴾﴾ [بنی اسرائیل: 13:17] ''اور ہم اس کے لیے قیامت کے دن ایک

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَ هُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝۵۰

اور جب ہم نے فرشتوں کو کہا آدم کی فرمانبرداری کرو تو انہوں نے فرمانبرداری کی مگر ابلیس نے (نہ کی) وہ جنوں میں سے تھا۔ سو اپنے رب کے حکم سے باہر نکل گیا تو کیا تم مجھے چھوڑ کر اسے اور اس کی نسل کو دوست بناتے ہو اور وہ تمہارے دشمن ہیں۔ ظالموں کے لیے کیا ہی برا بدل ہے۔ (1930)

کتاب نکالیں گے جسے وہ کھلا ہوا پائے گا۔'' [دیکھو نمبر: 1814] (غ)

﴿صَغِيْرَةً﴾۔ دیکھو ﴿كَبِيْرَةً﴾ کی بحث [نمبر: 646] اور فرمایا ﴿كُلُّ صَغِيْرٍ وَّ كَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ﴾ [القمر: 53:54] ''اور ہر ایک چھوٹی اور بڑی (بات) لکھی ہوئی ہے۔'' اور فرمایا ﴿وَ لَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَ لَآ اَكْبَرَ﴾ [یونس: 61:10] ''اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ بڑی۔'' تو یہ سب خیر اور شر کا بلحاظ قدر و منزلت کے بڑا یا چھوٹا ہونا ہے ایک دوسرے کی نسبت سے۔ (غ) پس یہاں ہر قسم کے اعمال مراد ہیں۔

1930 - جب پچھلے رکوع میں محبت دنیا اور محاسبہ اعمال کا ذکر کیا تو یہاں بتایا کہ انسان شیطان کے پیچھے لگ کر اس غلط راہ پر پڑتا ہے جس کا انجام ہلاکت ہے۔ شیطان کی نافرمانی کے لیے [دیکھو نمبر: 52] وغیرہ۔ یہاں کھول کر بتا دیا کہ شیطان ملائکہ میں سے نہیں بلکہ جنوں میں سے ہے۔ بایں صراحت عجیب عجیب کہانیاں ابلیس کو ملائکہ میں سے قرار دینے کے لیے بنائی گئی ہیں۔ کوئی جنوں کو ملائکہ کا قبیلہ قرار دیتا ہے۔ حالانکہ جن کے متعلق صراحت سے مذکور ہے کہ اسے نار سے پیدا کیا گیا اور ملائکہ کا نور سے پیدا ہونا حدیث سے ثابت ہے۔ کوئی اسے اشراف ملائکہ میں سے قرار دیتا ہے، کوئی کہتا ہے کہ جنوں اور فرشتوں کی جنگ ہوا کرتی تھی، ابلیس چھوٹا ہوتا قید میں آ کر ملائکہ میں آ گیا اور ملائکہ کی طرح عبادت کرنے لگا اس لیے ملائکہ میں سے سمجھا جانے لگا۔ یہ سب بے اصل باتیں ہیں۔ حسن کا قول ہے [قَاتَلَ اللّٰهُ أَقْوَامًا زَعَمُوْا أَنَّ إِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ كَانَ مِنَ الْجِنِّ] (فتح القدیر، جلد3، صفحہ420) (ر) ''اللہ تعالیٰ ان قوموں کو ہلاک کرے جنہوں نے خیال کیا کہ شیطان ملائکہ میں سے تھا اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وہ جنوں میں سے تھا۔''

ایک اور بات قابل توجہ یہ ہے کہ یہاں شیطان یا ابلیس کی ذریت بھی قرار دی گئی ہے۔ قتادہ سے روایت ہے [وَهُمْ يَتَوَالِدُوْنَ كَمَا يَتَوَالِدُ بَنُوْ آدَمَ.] (الطبری، جلد1، صفحہ506) یعنی ان کا سلسلہ نسل اسی طرح چلتا ہے جس طرح بنی آدم کا۔ اور اس سے بھی زیادہ صاف ابن زید کا قول ہے [قَالَ اللّٰهُ لِإِبْلِيْسَ: إِنِّيْ لَا أَذْرَأُ لِآدَمَ ذُرِّيَّةً إِلَّا ذَرَأْتُ لَكَ مِثْلَهَا] (ج) یعنی اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو کہا کہ میں آدم کی نسل میں کوئی شخص پیدا نہیں کروں گا مگر تیرے لیے اس کی مثل

مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۪ وَ مَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ﴿۵۱﴾

میں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرتے وقت انہیں گواہ نہ بنایا تھا اور نہ خود انہیں پیدا کرتے وقت۔ اور میں ایسا نہ تھا کہ گمراہ کرنے والوں کو (اپنا قوتِ بازو) بناتا۔ (1931)

وَ يَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ﴿۵۲﴾

اور جس دن کہے گا (انہیں) پکارو جنہیں تم میرا شریک قرار دیتے تھے، پس وہ انہیں پکاریں گے مگر وہ انہیں جواب نہ دیں گے اور ہم ان کے درمیان ہلاکت کو حائل کریں گے۔ (1932)

پیدا کروں گا۔ جس سے معلوم ہوا کہ ہر انسان کے لیے الگ شیطان ہوتا ہے۔ اور اس سے صفائی سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کا شیطان الگ ہے۔ اور فی الحقیقت ہر انسان کے بیہمی قویٰ سے جس ہستی کا تعلق ہے وہی اس کا شیطان ہے۔ مگر ان روایات کا یہ مطلب لینا کہ جنوں میں اسی طرح نکاح اور سلسلہ توالد و تناسل ہوتا ہے جس طرح انسانوں میں صحیح نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی ذریت وہ اسی لحاظ سے ہے کہ وہی کام کرتی ہے جو وہ کرتا ہے۔ چنانچہ بعض نے ذریت سے مراد اس کے اتباع لیے ہیں۔

1931 - ﴿عَضُدًا﴾۔ اصل میں وہ حصہ ہے جو کہنی اور کندھے کے درمیان ہے یعنی بازو اور استعارۃً مددگار کو بھی کہتے ہیں۔ (غ)

خلق میں عدم شرکت:

﴿مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ شاہد نہ بنانے سے کیا مراد ہے۔ شَاهِدٌ یا شَهِيْدٌ کے اصل معنی صرف گواہ کے ہیں۔ تو بعض نے اس سے مراد لیا ہے کہ ان سے مشورہ نہیں کیا اور بعض نے یہ کہ وہ اپنی مشیت کے مطابق پیدا نہیں ہوئے یعنی کامل پیدا نہیں ہوئے۔ (ر) لیکن کسی کو کسی اہم کام کے وقت بلانے سے منشا یہ ہوتا ہے کہ اس سے مدد لی جائے اسی بنا پر ﴿وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [البقرۃ: 23:2] ''اور اللہ کو چھوڑ کر اپنے مددگاروں کو بلالو'' میں شُهَدَآءَ سے مراد مددگار لیے گئے ہیں۔ اور ابن جریر نے یہی مراد لی ہے [مَا أَحْضَرْتُهُمْ ذٰلِكَ فَأَسْتَعِيْنَ بِهِمْ] اور خود آیت کے خاتمہ کے الفاظ اسی معنی پر دلالت کرتے ہیں۔ جہاں فرمایا کہ میں مُضِلِّيْنَ کو اپنا مددگار نہ بنا سکتا تھا۔ پس مراد یہ ہے کہ پیدائش میں یہ خدا کے شریک یا معاون نہیں کہ ان کی فرمانبرداری کی جائے۔ کیونکہ حق عبادت خلق سے پیدا ہوتا ہے۔ ﴿مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ﴾ میں کون مراد ہے؟ بعض نے شیاطین مراد لیے ہیں اور بعض نے کفار، بعض نے ملائکہ۔ مگر مراد یہاں وہ ہیں جنہیں شیاطین کے پیچھے لگ کر خدا کے شریک بنایا جاتا ہے اور اگلی آیت میں اسے صاف بھی کر دیا ہے ﴿نَادُوْا شُرَكَآءِيَ﴾ پس یہاں وہی شرکاء مراد ہیں اور انہی کو مُضِلِّيْنَ کہا ہے کیونکہ ان کی وجہ سے لوگ گمراہ ہوتے ہیں ﴿رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا﴾ [إبراهيم: 36:14] ''میرے رب! انہوں نے بہت کو گمراہ کیا ہے۔''

1932 - ﴿بَيْنَهُمْ﴾۔ بَيْنَ درمیان کے معنی میں بھی آتا ہے اور اس کے معنی وَصَلَ یعنی ملاپ یا تعلق بھی ہیں۔ دوسری جگہ ہے ﴿لَقَدْ

وَ رَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَ لَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ﴿۵۳﴾ ع 7 4 19

اور مجرم آگ کو دیکھیں گے تو یقین کرلیں گے کہ وہ اس میں پڑنے والے ہیں اور وہ اس سے ہٹ کر جانے کی کوئی جگہ نہ پائیں گے۔

وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾

اور بلاشبہ ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر قسم کی مثالیں بار بار بیان کی ہیں اور انسان بہت ہی جھگڑالو ہے۔ (1933)

وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَ يَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿۵۵﴾

اور کسی چیز نے لوگوں کو جب ہدایت ان کے پاس آ گئی اس بات سے نہیں روکا کہ وہ ایمان لائیں اور اپنے رب سے استغفار کریں مگر یہ کہ پہلوں کا طریق ان سے برتا جائے یا عذاب ان کے سامنے آ موجود ہو۔

وَ مَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَ

اور ہم رسولوں کو نہیں بھیجتے مگر خوش خبری دینے والے اور

تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ﴾[الأنعام: 94:6] ''یقیناً تمہارے تعلقات کٹ گئے۔'' جہاں وصل ہی مراد ہے۔ (غ) اور یہاں بھی یہی مراد ہے۔

مَوْبِقَ۔ وَبَقَ ایک امر سے باز رہا پس ہلاک ہوگیا۔ ﴿اَوْ يُوْبِقْهُنَّ﴾[الشوریٰ: 34:42] ''یا انہیں تباہ کردے۔'' پس مَوْبِقٌ ہلاکت ہے۔ (غ)

1933 - ﴿اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا﴾ سے یہ مراد نہیں کہ دوسری چیزوں کی نسبت انسان زیادہ جھگڑتا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ حالانکہ حق کو طرح طرح کے پیرایوں میں بار بار بیان کیا جاتا ہے مگر بایں بھی انسان سے جھگڑا ہی زیادہ سرزد ہوتا ہے اور وہ اسے قبول کرنے کی بجائے کج حجتی کرتا چلا جاتا ہے۔ اصل غرض اس رکوع کی ان اعدائے حق کے لیے وعدہ ہلاکت ہے جن کے ذکر سے یہ سورت مخصوص ہے ﴿وَّ يُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا﴾[4] مگر ابتدا اس وعدہ کی یوں کی کہ باوجود حق کی مختلف پیرایوں میں وضاحت کی بجائے اسے اختیار کرنے کے جھگڑنا شروع کردیتے ہیں۔

مُنْذِرِيْنَ ۚ وَ يُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَ اتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَ مَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿۵۶﴾

ڈرانے والے۔اور جو کافر ہیں وہ باطل پر جھگڑا کرتے ہیں تاکہ اس کے ساتھ حق کو زائل کر دیں اور میری آیتوں کو اور اسے جو انہیں ڈرایا جاتا ہے ہنسی سمجھتے ہیں۔(1934)

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَ نَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَ اِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۵۷﴾

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جسے اس کے رب کی آیتیں یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ ان سے منہ پھیر لیتا ہے اور اسے بھول جاتا ہے جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے۔(پس) ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں تاکہ اسے نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں بوجھ (ڈال دیا) ہے اور اگر تو انہیں ہدایت کی طرف بلائے تو وہ کبھی بھی ہدایت پر نہ آئیں گے۔(1935)

وَ رَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ؕ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ﴿۵۸﴾

اور تیرا رب بخشنے والا رحمت کا مالک ہے اگر وہ انہیں اس پر پکڑے جو وہ کماتے ہیں تو فوراً ان پر عذاب بھیج دے۔بلکہ ان کے لیے ایک وعدے کا وقت ہے جس کے مقابل پر وہ کوئی پناہ نہ پائیں گے۔(1936)

1934- يُدْحِضُوْا۔ دَحَضٌ کے معنی ہیں پھسلنا اور اِدْحَاضٌ پھسلانا۔(ل) اور دلیل کے دَاحِضٌ ہونے سے مراد اس کا باطل اور زائل ہونا ہے ﴿حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ [الشوریٰ: 16:42] ''ان کا جھگڑا ان کے رب کے نزدیک باطل ہے۔''

1935- [دیکھو نمبر: 926] یہاں بھی صاف ظاہر ہے کہ دلوں پر پردے ابتداءً نہیں بلکہ بطور سزا ڈالے جاتے ہیں۔ایک شخص آیات سے روگردانی کرتا ہے اور بدکاریوں میں بھی مبتلا ہے جیسا کہ ﴿نَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ﴾ سے ظاہر ہے۔اس لیے اس کے دل کا شیشہ سیاہ ہو جاتا ہے اور حق اس میں منعکس نہیں ہوتا۔

1936- مَوْئِلَ۔[وَالَ اِلَيْهِ] کے معنی ہیں اس کی پناہ میں گیا۔اور مَوْئِلٌ کے معنی ملجا یا پناہ ہیں۔(ل)

وَ تِلْكَ الْقُرٰى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَ جَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿۵۹﴾ ع 8 6 20

اوران بستیوں نے جب ظلم کیا ہم نے انہیں ہلاک کر دیا اوران کی ہلاکت کے لیے (بھی) ہم نے ایک وعدے کا وقت مقرر کر دیا ہے۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَاۤ اَبْرَحُ حَتّٰۤى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ﴿۶۰﴾

اور جب موسیٰ نے اپنے نوجوان (ساتھی) کو کہا میں (چلنا) نہیں چھوڑوں گا یہاں تک کہ دو دریاؤں کے اکٹھا ہونے کی جگہ پہنچ جاؤں یا برسوں چلتا رہوں۔ (1937)

وعدۂ ہلاکت:

مطلب یہ ہے کہ ظالموں کے کام تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر فوراً عذاب آ جائے مگر اللہ تعالیٰ کا غفر اور رحم بہت بڑا ہے۔ اس لیے بڑی مہلت دے کر عذاب بھیجتا ہے اور پھر جب وہ عذاب آتا ہے تو اس سے پناہ بھی کوئی نہیں ملتی۔ یہاں صاف طور پر بتا دیا کہ ان اعدائے حق کے لیے بھی جن کا ذکر ہو رہا ہے ایک وقت وعدہ عذاب کا ہے مگر وہ خدا کے علم میں ہے جلد نہیں آتا۔ اگلی آیت میں پہلوں کی ہلاکت کا ذکر کر کے صاف فرما دیا کہ ان کی ہلاکت بھی ایسی ہی یقینی ہے۔ مگر ہلاکت سے مراد محض ان کی قوت کا توڑنا ہوتا ہے جو حق کے مقابل پر ہوتی ہے۔

1937- بَرَحَ۔ ﴿لَاۤ اَبْرَحُ﴾ بَرَاحٌ فراخ کھلے مکان کو کہتے ہیں جس میں کوئی روک نہ ہو۔ اور بَرِحَ کے معنی ہیں بَرَاحَ میں قائم ہو گیا اور مراد اس سے ذال کی طرح نفی ہوتی ہے۔ اس لیے ﴿لَاۤ اَبْرَحُ﴾ اثبات کے معنی میں آتا ہے۔ کیونکہ دو نفیوں کا اجتماع اثبات ہوتا ہے ﴿لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ﴾ [طٰهٰ: 91:20] ''ہم اس کی عبادت میں لگے رہیں گے۔'' (غ)

﴿مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ﴾ دو دریاؤں یا دو سمندروں کے ملنے کی جگہ ہے۔ مجاہد، قتادہ وغیرہ سے مروی ہے کہ بحر فارس اور بحر روم ملنے کی جگہ مراد ہے۔ (ج) مگر یہ دونوں سمندر باہم ملتے ہی نہیں اور بعض نے کہا کہ وہ آرمینیا میں دو دریا ہیں۔ مگر وہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کبھی گئے ہی نہیں۔ اور اُبی سے مروی ہے کہ وہ افریقہ میں ہے۔ (د) اور یہی صحیح ہے۔ اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی بعثت سے پیشتر بھی اور بعثت سے بعد بھی مدت تک مصر میں رہے اور مجمع البحرین بحر ابیض اور بحر اسود یعنی دریائے نیل کی دونوں بڑی شاخوں کے ملنے کی جگہ ہے اور یہ خرطوم پر ملتے ہیں۔ اور بعض نے کہا کہ اس سے مراد بَحْرِ مِلْحٌ اور بَحْرِ عَذْبٌ یعنی نمکین اور میٹھے سمندر کا ملنا ہے۔ (ر) جن کا ذکر قرآن شریف میں ہے [الفرقان: 53:25] [فاطر: 12:35] مگر یہ خاص دو سمندروں کے نام نہیں۔ اور بعض نے کہا کہ یہ موسیٰ اور خضر کے ملنے سے مجاز ہے کیونکہ وہ علم کے دو دریا تھے۔ (ر) مگر اس صورت میں خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرمانا کہ میں ﴿مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ﴾ میں پہنچوں صحیح نہیں ٹھہرتا۔ ہاں مجازی معنی لے کر یوں

کہہ سکتے ہیں کہ دو بحر دنیا اور دین ہیں یا علوم دنیا اور علوم روحانی، اور اسی کی طرف فی الحقیقت [بَحْرَ مِلْحٌ] اور [بَحْرَ عَذْبٌ] میں بھی اشارہ ہے تو اس صورت میں مجازاً مراد دین و دنیا کا ملنا یا دینی اور علوم دنیوی کا اجتماع ہے۔ جو نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت کو میسر آیا اور نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو۔ بلکہ امت محمدیہ کے لیے یہ مقدر تھا۔ پس ظاہر طور پر ﴿مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ﴾ سے مراد بحر ابیض اور بحر اسود کے ملنے کی جگہ ہے اور اس میں اشارہ سلسلہ محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف ہے جیسا کہ آگے چل کر وضاحت سے دکھایا جائے گا۔

حُقُبٌ۔ حِقْبَةٌ زمانہ کی مدت ہے جس کا وقت مقرر نہیں اور سال کو بھی کہتے ہیں اور حُقَبٌ اور حُقُبٌ اسّی سال کو کہتے ہیں اور حُقبٌ کی جمع حُقَابٌ اور اَحْقَابٌ آتی ہے اور یا حُقَبٌ زمانہ ہے اور اَحْقَابٌ زمانے۔ اور ثعلب سے حُقُبٌ کے معنی ایک سال یا کئی سال مروی ہیں۔ (ل)

موسیٰؑ اور خضر علیہما السلام کے قصے پر اختلاف روایات:

یہاں سے وہ ذکر شروع ہوتا ہے جو خضر کے قصہ کے نام سے مشہور ہے۔ خضر کون تھے اور ان کا قصہ کیا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سے کیا سیکھنے گئے تھے؟ اور اس قصہ کو یہاں لانے کی کیا غرض ہے۔ جہاں پہلے بھی عیسائیت کا ذکر ہو رہا ہے اور ابھی ان اقوام کی ہلاکت کا ذکر کیا تھا اور بعد میں بھی یاجوج ماجوج کا ذکر ہے جو انہی اقوام سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ دو سوال ہیں جن کا جواب اشکال سے خالی نہیں۔ دوسرے سوال یعنی تعلق کی ایک ہی توجیہ مفسرین میں ملتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب اصحاب کہف کا ذکر یہود کے سوال پر کیا گیا تو اس قصہ کو لا کر یہ بتایا گیا کہ ضروری نہیں کہ نبی کو سب باتوں کا علم دیا جائے کیونکہ کہا جاتا ہے کہ یہود نے یہ کہا تھا کہ اگر آپ اصحاب کہف کا قصہ بتا دیں تو آپ نبی ہیں ورنہ نہیں۔ مگر میں دکھا چکا ہوں کہ یہ روایت ہی قابل قبول نہیں۔ اور تعلق کی یہ وجہ بھی کافی نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تلاش خضر علیہ السلام میں نکلنے کی وجہ:

میرے نزدیک سب سے زیادہ ضروری بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ احادیث قصص گو وہ صحیح بخاری یا دیگر صحاح میں ہوں اس قابل نہیں ہوتیں کہ ان کے ایک ایک لفظ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وثوق کے ساتھ منسوب کیا جا سکے اور اس فرق کو جو احادیث مسائل اور احادیث قصص میں ہے محدثین نے خود تسلیم کیا ہے۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہو قرآن شریف کے الفاظ پر قصص میں بہت سی تفصیلات کو بڑھانا نہیں چاہیے۔ قرآن شریف میں یہ ذکر نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ احادیث میں اختلاف ہے۔ بعض احادیث میں تو یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک مؤثر وعظ پر ایک شخص نے آپ سے سوال کیا کہ کیا آپ سے زیادہ علم والا کوئی شخص بھی دنیا میں موجود ہے۔ تو آپ نے فرمایا نہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو عتاب کیا اور فرمایا کہ ہمارا بندہ خضر ہے۔ اور بعض احادیث میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا تھا اگر کوئی مجھ سے زیادہ علم والا شخص ہو تو اس کا نشان مجھے بتائیے۔ تو اللہ تعالیٰ نے بتایا اور اس کے ملنے کی اجازت بھی دی۔ یہ دوسری حدیث ایک نبی کی شان کے زیادہ شایاں ہے۔ اس لیے دوسری کو ہم قبول کرتے ہیں۔ اور بعض روایات میں ہے کہ حضرت

موسیٰ علیہ السلام نے کئی سوال کیے تھے۔کون بندہ سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے؟ کون سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے؟ کون سب سے زیادہ علم والا ہے؟ تو اس آخری سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سب سے زیادہ علم والا وہ ہے جو دوسرے لوگوں کے علم کو طلب کرتا ہے کہ اس طرح سے اپنا علم بڑھائے۔اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا کہ مجھے اس شخص کا پتہ بتایا جائے جو مجھ سے زیادہ علم رکھنے والا ہے تا کہ میں اس کے پاس جاؤں۔تب اللہ تعالیٰ نے آپ کو خضر علیہ السلام کا پتہ بتایا۔ پس معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ سفر اس لیے کرایا تا انہیں معلوم ہو جائے کہ ان کا علم صرف ایک قوم کے لیے ہے۔ایسا ہی علم اللہ تعالیٰ نے اور لوگوں کو بھی دیا ہے اور قرآن کریم سے ان کی تائید ان الفاظ سے ہوتی ہے ﴿ اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴾[66] اور اس قصہ کے یہاں لانے کی غرض یہ ہے کہ ایک طرف عیسائیوں کے ان اعتراضات کا جواب دیا جائے جو وہ آنحضرت ﷺ پر کرتے ہیں۔اکثر عیسائی مورخین اس بات کے قائل ہیں کہ مکہ میں آپ کی زندگی بالکل بے لوث تھی مگر مدینہ میں آ کر بادشاہ بن کر لوگوں کو ناحق قتل کیا۔اس کا جواب یہاں دیا ہے کیونکہ سب سے بڑی بات جو حالات خضر میں نظر آتی ہے وہ ایک ایسے شخص کا قتل ہے جس پر الزام قتل کوئی نہ تھا اور باقی دو معاملات میں بھی آنحضرت ﷺ کی صداقت کی طرف ہی اشارہ ہے،جس کے لیے [دیکھو نمبر: 1952]۔دوسری طرف یہ بھی اس قصہ کے لانے کی غرض معلوم ہوتی ہے کہ یہ بتایا جائے کہ سلسلہ موسوی ایک محدود سلسلہ تھا جس کا پیغام کل دنیا کی طرف ہونا تو ایک طرف رہا وہ قومیں جو بنی اسرائیل سے بالکل قریب رہتی تھیں ان کے حالات سے بھی ان کو واقفیت نہ تھی اور نہ وہ سلسلہ دوسری قوموں کی ہدایت کے لیے تھا۔ بلکہ ان قوموں کو علیحدہ ہدایتیں دی گئی تھیں اور وہ ایسی ہدایتیں تھیں جن سے خود حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ناواقف تھے۔ عیسائیوں نے یہ سخت غلطی کھائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحی کو چند انبیائے بنی اسرائیل تک محدود کیا ہے۔تیسرے یہ بھی ظاہر کرنا مقصود معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی پیشگوئیاں خود یہود و نصاریٰ کی کتابوں میں موجود ہیں۔اور اس سورت میں چونکہ عیسائیت کے حالات سے بحث تھی اس لیے اس قصہ کو یہاں لایا گیا ہے تا وہ اسلام کی طرف رجوع کریں۔

حضرت موسیٰؑ کا سفر خرطوم:

سب سے پہلے اس تذکرہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا فی الواقع بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوئی ایسا سفر کیا۔جو واقعات آپ کے بائبل میں موجود ہیں ان میں کوئی ایسا ذکر نہیں۔نہ علمائے یہود کی روایات میں ایسا ذکر ہے۔لیکن تورات میں یہ ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ کی ایک بی بی اس علاقہ کی تھیں ''اور مریم اور ہارون نے موسیٰ کا شکوہ اس کوشی عورت کی بابت کہ اس نے لی تھی کیا کیونکہ اس نے ایک کوشی عورت لی تھی۔''[گنتی 1:12] اور علمائے یہود کی روایات میں جو ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایتھوپیا گئے تھے جو مصر کے جنوب میں ایک بادشاہت تھی جس کی جنوبی حد خرطوم ہے۔ بلکہ یہ بھی ذکر ہے کہ اس ملک کے بادشاہ کی بیوہ کے ساتھ انہوں نے شادی بھی کی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ انہی کی تدبیر اور بہادری سے اس کو ایک بڑے قوی دشمن سے نجات ملی تھی۔پس ان حالات کے ہوتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایسا سفر کرنا بالکل قرین قیاس ہے۔اور چونکہ مدین سے واپس آ کر آپ کو بہت وقت مصر میں رہنا پڑا اس لیے اغلب یہی ہے کہ یہ سفر اس وقت پیش آیا۔

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿٦١﴾

پس جب وہ ان دونوں (دریاؤں) کے اکٹھا ہونے کی جگہ پہنچے وہ اپنی مچھلی بھول گئے تو اس نے چلتے چلتے اپنا رستہ دریا میں لے لیا۔ (1938)

یوشع:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فتی یا نوجوان ساتھی یا خادم جس کا یہاں ذکر ہے اس کا نام معلوم کرنے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔ مگر اکثر روایات میں اس کا نام یوشع دیا گیا۔ یہ وہی یوشع ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جانشین بھی ہوئے۔

1938 - **مچھلی کا بھولنا اور اس کا دریا میں چلا جانا:** اس آیت میں دو باتوں کا ذکر ہے۔ ایک یہ کہ مجمع البحرین کے موقعہ پر پہنچ کر وہ مچھلی کو بھول گئے اور دوسرا یہ کہ وہ مچھلی دریا میں چلی گئی۔ اگر صرف الفاظ قرآنی کی تشریح مطلوب ہو تو اس میں چنداں دقت معلوم نہیں ہوتی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ دریا کے کنارہ پر چل رہے تھے۔ سفر میں جب ٹھہر جاتے ہوں گے تو مچھلی پکڑ لیتے ہوں گے تاکہ بھوک کے وقت غذا کا کام دے سکے۔ اور سہل ترین غذا یہی تھی جو اس حالت میں میسر آ سکتی تھی۔ اور اگلی آیت اور اس سے اگلی آیت صاف بتاتی ہیں کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غذا مانگی تو آپ کے ساتھی نے کہا کہ مچھلی تو میں بھول گیا یعنی ساتھ نہیں لایا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مچھلی غذا کے لیے ساتھ رکھتے تھے اور مچھلی کا دریا میں چلا جانا بھی معمولی بات ہے۔

سَرَبٌ اور سَرَبٌ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 1604]۔ صرف [اَلذَّهَابُ فِيْ حُدُوْرٍ] یعنی نیچے کی طرف چلا جانا ہیں اور راغب نے یہی معنی دے کر اس آیت کو نقل کیا ہے اور سَارِبٌ کے معنی چلنے والا وہیں آ چکے ہیں۔ پس سَرَبًا بلحاظ معنی ﴿فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ﴾ کے لیے مصدر مؤکد کے طور پر ہے اور تفسیر ابن جریر میں ہے کہ سَرَبٌ سے مراد مسلک اور رستہ ہے یعنی دریا میں رستہ بنا کر چلی گئی اور بخاری میں بھی سَرَب کے معنی مذہب یعنی رستہ ہی ہیں۔

مچھلی کا بطور نشان دیا جانا:

لیکن بخاری کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کیا کہ میں اس شخص تک کس طرح پہنچوں تو آپ کو بذریعہ وحی اطلاع دی گئی [فَأَوْحٰى إِلَيْهِ: أَنِ ائْتِ الْبَحْرِ، فَإِنَّكَ تَجِدُ عَلٰى شَطِّ الْبَحْرِ حُوْتًا، فَخُذْهُ فَادْفَعَهُ إِلٰى فَتَاكَ، ثُمَّ الْزَمَ شَطَّ الْبَحْرِ، فَإِذَا نَسِيْتُ الْحُوْتَ وَهَلَكَ مِنْكَ، فَثَمَّ تَجِدُ الْعَبْدُ الصَّالِحِ الَّذِيْ تَطْلُبُ.] (ابن کثیر، جلد5، صفحہ 179) یعنی اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ دریا پر چلے جاؤ تو دریا کے کنارے ایک مچھلی تمہیں ملے گی اس کو لے لو اور اسے اپنے ساتھی کو دے دو۔ پھر دریا کے کنارے کنارے چلتے جاؤ۔ پس جہاں تم مچھلی بھول جاؤ اور وہ گم ہو جائے وہیں تم اس عبد صالح کو پاؤ گے جس کی تلاش کرتے ہو۔ اور ایک اور روایت میں ہے [قَالَ: تَأْخُذُ مَعَكَ حُوْتًا، تَجْعَلَهُ بِمِكْتَلٍ، فَحَيْثُمَا فَقَدْتَّ الْحُوْتَ فَهُوَ ثَمَّ] (ث) یعنی ایک مچھلی ساتھ لے لو اور اسے ایک زنبیل میں رکھ لو۔ پھر جہاں وہ مچھلی گم ہو جائے وہیں وہ ہوگا۔ پھر کسی روایت میں اسے مری

فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ۫ لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿۶۲﴾

سو جب وہ دونوں آگے نکل گئے (موسیٰ نے) اپنے نوجوان (ساتھی) سے کہا ہمارا صبح کا ناشتہ لے آ ہمیں اس (آج کے) سفر سے تکان ہوگئی ہے۔ (1939)

ہوئی مچھلی کہا گیا ہے اور کسی میں نمکین اور کسی میں بھنی ہوئی۔

مچھلی کا بھنا ہوا ہونا قابل قبول نہیں:

اب روایات کو قبول کرتے وقت یا ان روایتوں کو قبول کرنا پڑے گا جو قرآن شریف کے بیان کے مطابق ہیں کہ معمولی مچھلی تھی اور دریا کے کنارے سے لے لی تھی اور یا ان کو جن میں اس کے بھنے ہوئے اور نمکین ہونے کا ذکر ہے۔ اقرب الی الصواب یہی ہے کہ ان زوائد کو کہ وہ نمکین تھی یا کباب تھا قبول نہ کیا جائے۔

اسی قسم کے دوسرے قصے:

علاوہ ازیں جو الفاظ اس قسم کے ہیں کہ جہاں چٹان کے پاس مچھلی رکھی تھی وہاں آب حیات کا چشمہ تھا اور یوشع کے وضو کے قطرے مچھلی پر پڑے تو وہ مچھلی زندہ ہوگئی۔ یہ بھی ساتھ ہی رد کر دینے کے قابل ہیں۔ اور سَرَبَ پر جو اور حاشیے چڑھائے گئے ہیں کہ جہاں سے مچھلی گزرتی تھی پانی جمتا چلا جاتا تھا یا پتھر کی طرح ہوتا جاتا تھا یا واقعی پتھر ہوتا جاتا تھا۔ اور ایک روایت میں تو کمال کر دیا ہے کہ دریا میں آگے آگے مچھلی بھاگی جاتی تھی پیچھے پیچھے حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے عصا کی مدد سے پانی کو چیرتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک جزیرہ پر پہنچ گئے جہاں خضر کو ملے اور مچھلی کے چھونے سے پانی پتھر کی طرح ہوتا جاتا تھا۔ ان تمام باتوں کی قرآن شریف میں کوئی اصلیت نہیں اور روایات قصص اس قدر قابل اعتماد نہیں کہ ان کے ایسے بعید از عقل قصے بھی قبول کیے جائیں۔

حصول علم کے لیے سفر اور صعوبت کا اٹھانا:

ہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ معمولی طور پر اگر کھانے کی مچھلی اسے سمجھا جائے تو قرآن شریف نے اس کا ذکر کیوں کیا۔ سو بات یہ ہے کہ بتانا یہ تھا کہ علم کے حاصل کرنے کے لیے انبیاء نے کیا کیا صعوبتیں اٹھائی ہیں اور علم سے کس قدر محبت رکھتے تھے کہ اتنا بڑا سفر اختیار کیا جس میں سواری کا بھی کوئی انتظام نہیں۔ اور پھر غذا کے ساتھ لینے کا بھی کوئی اہتمام نہیں کیا بلکہ مچھلی پر ہی صبر کیا جو وہیں دریا کے کنارے سے مل جاتی تھی۔ باقی یہ ہوسکتا ہے کہ حدیث کے الفاظ میں رواۃ سے اس قدر تصرف ہوگیا ہو کہ روزمرہ غذا کی مچھلی کو نشان سمجھنے کی بجائے انہوں نے ایک ہی خاص مچھلی کو نشان سمجھ لیا ہو۔ ممکن ہے کہ یہی نشان قرار دیا گیا ہو کہ روزمرہ غذا کی مچھلی جہاں بھول جاؤ وہیں وہ ہوگا۔

1939 - انبیاء کی فطرت ایسی سلیم ہوتی ہے کہ اتنے لمبے سفر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوئی تکان محسوس نہیں کی جب تک کہ حد مقررہ سے آگے نہیں نکل گئے۔

قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّىْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۖ وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِى الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ﴿٦٣﴾

کہا دیکھیے، جب ہم نے چٹان پر پناہ لی تھی تو میں مچھلی بھول گیا اور شیطان نے یہ مجھے بھلا دیا کہ اس کا ذکر کروں اور اس نے سمندر میں اپنا رستہ لے لیا، تعجب ہے۔ (1940)

1940 - ﴿صَخْرَۃٌ﴾۔ صَخَرَ۔ صَخْرَۃٍ۔ [اَلصَّخْرَۃُ الْعَظِیْمُ الصُّلْبِ] (ل) یعنی بہت بڑے اور سخت پتھر کو صَخْرَۃٌ کہا جاتا ہے ﴿فَتَكُنْ فِىْ صَخْرَةٍ﴾[لقمٰن: 16:31] ''کسی پتھر کے اندر ہو'' جمع صَخَرٌ ہے ﴿جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ﴾[الفجر: 9:89] ''جنہوں نے وادی میں چٹان تراشے۔''

عَجَبَ۔ تَعْجَبَ عَجَبًا۔ عَجَبٌ اور تَعَجُّبٌ وہ حالت ہے جو انسان کو کسی چیز کے سبب سے ناواقفیت کی وجہ سے پیش آتی ہے اور بعض حکما کا قول ہے کہ عجب وہ ہے جس کا سبب سمجھ نہ آئے۔ ﴿كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝﴾ میں یہ بتایا ہے کہ یہ کوئی بڑے تعجب کی بات نہیں بلکہ ہمارے امور میں اس سے بھی بڑی اور عجیب تر باتیں ہیں۔ اور یہاں عَجَبًا فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے اور اس کی تقدیر یوں ہے [اَعْجَبَ عَجْبَارٌ] (ر) یعنی میں اسباب پر تعجب کرتا ہوں کہ یہ آپ سے ذکر کرنا مجھے کیوں یاد نہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ تحریر میں ﴿فِى الْبَحْرِ﴾ کے بعد وقف لا کر پھر عَجَبًا آتا ہے گویا اسے علیحدہ کیا ہے۔

مچھلی بھول جانے کا سبب:

اٰوٰی کے لفظ سے جس میں پناہ لینے کا مفہوم پایا جاتا ہے [دیکھو نمبر: 1227]، معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چٹان پر پناہ لی اور چونکہ ان کا سفر دریا کے کنارے کنارے تھا اس لیے پناہ سیلاب سے ہی لی ہوگی جو یکا یک آ گیا اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایسا وقت تھا جب آپ آرام کر رہے تھے تو گھبراہٹ میں اٹھنا پڑا۔ مچھلی کو بھول جانے کی بھی یہی وجہ ہے۔ خواہ یہ خاص مچھلی ہو جو بطور نشان ساتھ لی گئی تھی یا محض کھانے کے لیے کوئی مچھلی دریا سے پکڑ کر ساتھ رکھی ہو۔ ناشتہ کے مانگنے پر آپ کے ساتھی کا یہ کہنا بتاتا ہے کہ دوسری صورت تھی۔ لیکن حدیث میں اسے خاص مچھلی قرار دیا ہے جو بطور نشان ساتھ لی تھی۔ تو اس صورت میں غذا کے ذکر کی وجہ سے مچھلی کا خیال یوشع کو آ گیا۔ کیونکہ گو وہ مچھلی بطور نشان تھی مگر مچھلی کھائی بھی جاتی تھی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مچھلی آپ کھاتے بھی تھے۔ کیونکہ اگر وہی نشان والی مچھلی ہی کھاتے ہوتے تو اتنے لمبے سفر میں وہ کفایت کیونکر کر سکتی تھی۔ یہاں کہا ﴿فَاِنِّىْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ﴾ اور پہلی آیت میں ہے ﴿نَسِيَا حُوْتَهُمَا﴾ یعنی دونوں بھول گئے۔ یہ دونوں باتیں درست ہیں۔ اس لیے کہ دونوں میں سے کسی کو مچھلی کا ساتھ لینا یاد نہ رہا اور اکیلے ساتھی کی طرف اس لیے منسوب ہے کہ اس کے سپرد یہ کام خصوصیت سے تھا۔

قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۚ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿٦٤﴾

کہا، یہی تو ہے جو ہم تلاش کرتے تھے، سو وہ دونوں اپنے (پاؤں کے) نشانوں کا پیچھا کرتے ہوئے واپس لوٹے۔ (1941)

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿٦٥﴾

پس انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جسے ہم نے اپنے پاس سے رحمت عطا فرمائی تھی اور اپنے پاس سے اسے علم سکھایا تھا۔ (1942)

1941 - **حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے نشان بروئے روایات صخرۃ بھی تھا اور مچھلی بھول جانا بھی:** پچھلی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رفیق نے دو باتوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک چٹان پر پناہ لینے کا دوسرا مچھلی بھول جانے کا۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو فرمایا ﴿ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ﴾ یہی ہم تلاش کرتے تھے تو ممکن ہے کہ ان کی مراد صخرۃ ہو۔ یعنی صخرۃ ہی تو ہماری مقررہ جگہ تھی اور ممکن ہے مراد یہ ہو کہ مچھلی کا بھول جانا ہی نشان تھا۔ اکثر روایات میں تو نشان مچھلی کا بھول جانا ہی قرار دیا ہے۔ اور ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پتہ دریافت کیا تو آپ کو بتایا گیا [عِنْدَ الصَّخْرَةِ الَّتِيْ عِنْدَهَا الْعَيْنُ] اس چٹان کے پاس جس کے قریب چشمہ یا دریا ہے۔ ممکن ہے وہاں کوئی چشمہ بہتا ہو اور ممکن ہے عین سے مراد دریا ہی ہو۔ غرض صخرۃ کے ذکر پر یا مچھلی بھول جانے کے ذکر پر حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس ہوئے۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ انبیاء سے بھی غلطی یا فروگذاشت ایسے معاملات میں ہو جاتی ہے جو شریعت سے تعلق نہیں رکھتے۔ مگر اللہ تعالیٰ ان کو غلطی پر قائم نہیں رکھتا بلکہ جلد ہی اس کے دور کرنے کے سامان پیدا کر دیتا ہے۔ خواہ بذریعہ اپنی وحی کے ساتھ ایسا کرے خواہ اور واقعات پیدا کر کے۔

1942 - **خضر علیہ السلام کون تھے:** یہ بندہ کون تھا؟ احادیث میں ان کا نام خضر آیا ہے۔ مگر ان کے بارہ میں اختلاف اقوال کی کوئی حد نہیں۔ بعض ان کو ولی، بعض نبی غیر مرسل، بعض نبی رسول کہتے ہیں۔ بعض انہیں ایک فرشتہ قرار دیتے ہیں۔ پھر کوئی کہتا ہے وہ آدم کی پیٹھ سے ان کے فرزند تھے۔ بعض انہیں قابیل کا فرزند کہتے ہیں، کوئی انہیں ارمیاہ اور کوئی الیسع قرار دیتا ہے، کوئی فرعون کا بیٹا اور کوئی فرعون کی بیٹی کا بیٹا قرار دیتا ہے۔

وفات خضر علیہ السلام:

پھر کوئی کہتا ہے کہ وہ اب تک زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے، یہاں تک کہ دجال کی تکذیب کریں۔ اہل علم کہتے ہیں وہ مر گئے۔ صوفی کہتے ہیں وہ اب بھی موجود ہیں اور لوگ ان سے ملاقات بھی کرتے ہیں۔ بعض ان سے علم سیکھنے کا بھی دعویٰ کرتے ہیں۔ اس میں تو کچھ شک نہیں کہ اگر وہ انسان تھے تو اپنے وقت پر فوت ہو چکے۔ روح المعانی۔

حدیث لَوْ كَانَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى حَيَّيْنِ اور وفات عیسیٰ علیہ السلام:

ابن کثیر نے فتح البیان میں اسی کو صحیح ٹھہرایا ہے۔ کیونکہ اگر وہ زندہ ہوتے تو آنحضرت ﷺ کی اتباع ان کے لیے لازمی تھی۔ اسی موقعہ پر ابن کثیر نے آنحضرت ﷺ کی اس حدیث کو نقل کیا ہے [لَوْ كَانَ مُوسَى وَعِيسَى حَيَّيْنِ لَمَا وَسِعَهُما إِلَّا اتِّبَاعِي.] (ابن كثير، جلد2، صفحہ: 68) اگر موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام زندہ ہوتے تو انہیں بھی میری اتباع کرنا پڑتی۔ **جس سے نہ صرف خضر علیہ السلام کا وفات یافتہ ہونا ثابت ہوتا ہے بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی وفات یافتہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔**

خضر علیہ السلام کی ملاقات:

اور یہ جو بڑی کثرت سے **صوفیا کی شہادت ملتی ہے کہ وہ خضر کو ملے تو یہ ملنا بطور مکاشفہ** ہے۔ جیسا کہ اور انبیاء اور صلحا کی بھی ملاقات رؤیا یا کشف میں ہو جاتی ہے۔

خضر علیہ السلام کی نبوت:

دوسری بات جو وثوق سے کہی جا سکتی ہے یہ ہے کہ اگرچہ جمہور نے خضر کو ولی یا نبی غیر مرسل مانا ہے لیکن ان کے جن حالات کا ذکر قرآن شریف میں ہے ان سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم کی طرف رسول تھے۔ گو بلحاظ ضروریات قومی ان کی نبوت کا رنگ علیحدہ ہو۔ ان کے نبی ہونے کا یہ قطعی ثبوت ہے کہ قرآن شریف سے ان کی وحی حجت ثابت ہوتی ہے۔ ولی کا الہام حجت شرعی نہیں ہوتا جب تک شریعت اس کی تصدیق نہ کرے۔ صرف نبی کی وحی حجت ہوتی ہے۔ میں اس جگہ ایک چھوٹا سا واقعہ لکھتا ہوں جو ولی کے الہام اور شریعت کے تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ اس صدی کے مجدد حضرت **مرزا غلام احمد صاحب قادیانی** کو ایک دفعہ انتیس روزوں کے گزر جانے پر الہام ہوا کہ عید تو آج ہے چاہو کرو یا نہ کرو۔ مگر انتیس کے دن قادیان اور اس کے گرد و نواح میں چاند نہ دیکھا گیا۔ صبح کو جب آپ نے یہ الہام سنایا تو بعض لوگوں نے دریافت کیا کہ جب الہام آپ کو ہو گیا ہے تو کیا ہم روزے نہ کھول دیں اور عید نہ کر لیں۔ آپ نے فرمایا نہیں یہ شریعت کا مسئلہ ہے کہ انتیس کو اگر چاند نظر آئے تو عید کی جائے اس لیے روزہ ہی رکھنا چاہیے۔ بعد میں دوسرے مقامات سے تاریں آ گئیں کہ چاند پہلی شب یعنی انتیس کا دیکھا گیا۔ یوں الہام کی بھی تصدیق ہو گئی۔ مگر عمل شریعت پر ہی ہوا۔ اور یہی امت کا مسلمہ مذہب ہے۔ پس خضر کے اپنی وحی کو حجت قطعی ٹھہرانے سے یہ صاف ثابت ہوتا ہے کہ وہ رسول اور نبی تھے۔

مقامی نبوتیں اور مقامی ضروریات:

ہاں یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ باوجود نبی ہونے کے ان کو جو احکام دیئے گئے ان کا رنگ کچھ اور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا: [يَا مُوسٰى إِنِّيْ عَلٰى عِلْمٍ مِنْ عِلْمِ اللهِ عَلَّمَنِيْهِ لَا تَعْلَمُهٗ أَنْتَ، وَأَنْتَ عَلٰى عِلْمٍ عَلَّمَكَهُ اللهُ لَآ أَعْلَمُهٗ.] (صحيح البخارى، كتاب العلم، باب مَا يُسْتَحَبُّ لِلْعَالِمِ إِذَا سُئِلَ أَيُّ النَّاسِ أَعْلَمُ فَيَكِلُ الْعِلْمَ إِلَى اللهِ، حديث: 122) اے موسیٰ میں اللہ تعالیٰ کے علم میں سے ایک علم پر ہوں جو اس نے مجھے سکھایا ہے جسے تو نہیں جانتا۔ اور تو اللہ کے علم میں سے ایک علم پر ہے جو اللہ نے تجھے سکھایا ہے اسے میں نہیں جانتا۔ مطلب یہ کہ تم ایک قوم کے لیے

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿٦٦﴾

موسیٰ نے اسے کہا میں تیرے ساتھ چلوں اس (شرط) پر کہ تو مجھے اس میں سے سکھائے جو بھلائی تجھے سکھائی گئی ہے۔ (1943)

مبعوث ہوئے ہو تمہیں ایک علم دیا گیا ہے جو اس کی ضروریات کے مطابق ہے۔ میں ایک دوسری قوم کے لیے مبعوث ہوا ہوں مجھے وہ علم دیا گیا ہے جو اس قوم کے حالات کے مطابق ہے۔ نہ تمہارا علم مجھے فائدہ دے سکتا ہے نہ میرا تمہیں۔ ضروریات قومی کا اقتضا یہی تھا کہ ہر قوم کے نبی کو اس قوم کے حالات کے مطابق علم دیا جاتا۔

ضروریات نسل انسانی کا کامل علم آنحضرت کے لیے مخصوص ہوا:

کامل عمل ہر قسم کی انسانی ضروریات کا صرف ایک ہی انسان کے لیے مقدر تھا۔ یعنی محمد رسول اللہ ﷺ۔ اسی لیے آپ کو ایک قوم کی طرف مبعوث نہیں کیا گیا بلکہ ﴿كَآفَّةً لِّلنَّاسِ﴾ مبعوث کیا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دائرہ ہمت اسباب کا مقتضی نہ تھا کہ انہیں سوائے بنی اسرائیل کے اور قوموں کی طرف بھی مبعوث کیا جاتا۔

خضر علیہ السلام کے فرشتہ ہونے کا قول:

اور اگر خضر کو ایک فرشتہ مانا جائے جیسا کہ ایک قول میں ہے تو پھر جن واقعات کا آگے ذکر آتا ہے وہ سب خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بطور کشف پیش آئے اور اس پر یہ اعتراض نہیں ہوسکتا کہ بطور کشف واقعات کے لیے سفر کی کیا ضرورت تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کے مصالح ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر جاتے ہیں تو وحی ہوتی ہے۔ حالانکہ خدا کی وحی تو ہر جگہ ہوسکتی ہے۔ پھر وہیں طور پر جا کر ہی شریعت ملتی ہے۔ پس ایسا سفر کرانا بھی اللہ تعالیٰ کے مصالح میں سے تھا۔ اور درحقیقت وحی اور مکاشفات کے لیے بہت بڑی محنت شاقہ بکار ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جس رنگ میں چاہے وہ کرالے۔ مگر میرے نزدیک ترجیح اس بات کو ہے جس پر اکثر ہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام انسان تھے۔

1943 - **اتباع سے مراد:** اَتَّبِعُكَ۔ اس سے مراد وہ اتباع نہیں جو ایک نبی کا پیرو نبی کا اتباع کرتا ہے۔ یعنی عبادات، معاملات وغیرہ میں نقش قدم پر چلنا۔ بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ جہاں تم جاؤ وہاں میں بھی جاؤں یعنی ساتھ رہنا مراد ہے۔ تاکہ جو واقعات خضر کو پیش آئیں آپ بھی انہیں دیکھ سکیں۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ خضر کی اتباع کے لیے نہیں آئے تھے۔ بلکہ ان کے واقعات کا کچھ علم حاصل کرنے آئے تھے۔

موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کا علم:

یہاں سے معلوم ہوا کہ جو علم خضر کو دیا گیا وہ اور تھا۔ کیونکہ علم تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی دیا گیا تھا جیسا کہ فرمایا ﴿اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا﴾ [القصص: 14:28] ''ہم نے اسے فہم اور علم دیا'' اور چونکہ دونوں علم علمِ دین ہیں اس لیے دین کا ایک علم حضرت

قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٦٧﴾

اس نے کہا تو میرے ساتھ صبر نہیں کر سکے گا۔

وَ كَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿٦٨﴾

اور تو کس طرح اس پر صبر کرے گا جس کی تجھے پوری پوری خبر نہیں۔ (1944)

قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّ لَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ﴿٦٩﴾

(موسیٰ نے) کہا تو مجھے انشاء اللہ صابر پائے گا اور میں کسی معاملہ میں تیری نافرمانی نہیں کروں گا۔

قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿٧٠﴾ ع 9 11 21

کہا اگر تو میرے ساتھ چلے تو مجھ سے کسی بات کا سوال نہ کرنا یہاں تک کہ میں خود تجھ سے اس کا ذکر کروں۔ (1945)

موسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا جو ان کی قوم کی ضروریات کے مطابق تھا اور دین کا ہی ایک علم حضرت خضر علیہ السلام کو دیا گیا جو ان کی قوم کی ضروریات کے مطابق تھا۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ اپنی اپنی امت کے متعلق اللہ تعالیٰ بعض وقت اپنے انبیاء کو خاص واقعات کا علم دے دیتا ہے جہاں تک ظاہر نظریں نہیں پہنچ سکتیں۔ اور وہ ایک ایسا فعل اس علم کی بنا پر کر لیتے ہیں جو ظاہر نظروں میں قابل اعتراض بھی ہوتا ہے۔ لیکن اگر حقیقت پر غور کیا جائے اور ان کے سارے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو وہ اعتراض نہیں رہتا۔

1944 - خُبْرًا خَبْرًا اشیائے معلومہ کا علم ہے جو خبر دینے سے ملے اور بعض نے خَبَرٌ اور خُبْرٌ میں یہ فرق کیا ہے کہ خبر کے معنی ایک امر باطن کی معرفت ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام کے صبر نہ کر سکنے کی وجہ:

نبی بھی ایک بشر ہے۔ جب ایک صفت اس میں غالب ہو تو اس کا اظہار ہونے سے نہیں رہتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام باوجود اپنے مشہور حلم اور بردباری کے حق کی غیرت اس قدر رکھتے تھے کہ جب انہوں نے ایک موقعہ پر حضرت ہارون علیہ السلام کو قوم کی غلطی میں شریک سمجھا تو ان سے بھی یہاں تک سختی سے پیش آئے کہ جس پر حضرت ہارون علیہ السلام کو یہ کہنا پڑا ﴿لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَ لَا بِرَاْسِيْ﴾ [طٰهٰ: 94:20] ''میری داڑھی اور میرا سر نہ پکڑ۔'' حضرت خضر علیہ السلام کو معلوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے یہ خبر بھی دے دی تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور قسم کی صفات الٰہی کے مظہر ہیں اور حضرت خضر علیہ السلام اور کے۔ اس لیے انہوں نے کہا کہ آپ کا میرے ساتھ صبر کرنا مشکل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اندر اور قسم کے کمالات رکھے ہیں مجھے اور قسم کے کمالات سے حصہ دیا ہے۔

1945 - اس شرط کے لگانے کی وجہ وہی معلوم ہوتی ہے جس کا ذکر اوپر کے نوٹ میں ہوا۔ بتانا یہی مقصود تھا کہ تمہارے کمالات اس

فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ۭ قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـــًٔا اِمْرًا ۝

پس وہ دونوں چلے۔ یہاں تک کہ کشتی میں سوار ہوئے تو اس نے کشتی کو پھاڑ دیا۔(موسیٰ نے) کہا کیا تو نے اسے پھاڑ دیا تا کہ اس کے سواروں کو غرق کر دے۔ یقیناً تو نے ایک خطرناک بات کی۔(1946)

بات کے متحمل نہیں ہو سکتے جو مجھ میں ہے۔تمام قسم کے کمالات کا صرف ایک ہی انسان میں جمع ہونا مقدر تھا اور وہ ذات پاک نبوی ہے۔

1946- سَفِیْنَۃِ۔ سَفَنَ لکڑی وغیرہ کسی چیز کے بیرونی حصے کا تراشنا ہے۔اسی لحاظ سے کشتی کو سفینہ کہا جاتا ہے۔(غ)

اِمْرًا۔[اَمِرَ الْاَمرُ] کے معنی ہیں[کَبُرَ وَ کَثُرَ] بڑا ہوا اور بہت ہوا۔اس لیے اِمْرٌ کے معنی منکر ہیں یعنی برا۔(غ) یا بڑی مصیبت والی منکر بات اور بعض کے نزدیک یہ نُکْرٌ سے بڑھ کر ہے جو آگے غلام کے قتل پر آیا ہے۔اس لیے کہ کشتی کے ٹوٹنے سے بہت آدمیوں کے غرق ہونے کا خطرہ تھا۔(ل) خَرَقَ کے لیے[دیکھو نمبر: 991]۔

خضر علیہ السلام کا کشتی توڑنا:

اس رکوع میں ان تین واقعات کا ذکر ہے جو حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کو پیش آئے۔ پہلا واقعہ کشتی کا توڑنا ہے۔اس میں جو ﴿لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا﴾ ہے تو یہ مطلب نہیں کہ کشتی کو اس غرض کے لیے توڑا ہے۔ بلکہ لام عاقبت کا ہے یعنی کشتی کو توڑ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کشتی والے غرق ہو جائیں۔خضر کے اس طرح کشتی توڑنے سے اور آگے غلام کو قتل کرنے سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ خضر ایک ایسا انسان تھا جسے عام آنکھیں نہیں دیکھتی تھیں، صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام دیکھتے تھے۔ ورنہ لوگ اسے کشتی توڑنے یا قتل کرنے سے روک دیتے۔تو یہ صورت مکاشفہ کی ہوگی یعنی وہ صورت جب خضر کو انسان نہیں بلکہ فرشتہ سمجھا جائے۔

خضر علیہ السلام خاندان بادشاہت سے تھے:

اور نووی نے تہذیب الاسماء میں لکھا ہے کہ خضر بادشاہت کے خاندان سے تھے اور ممکن ہے کہ انہیں خود بھی اس علاقہ میں کوئی ریاست یا بادشاہی حاصل ہو جس وجہ سے انہیں روکا نہیں گیا یا ان لوگوں کو ان پر اس قدر اعتقاد ہو کہ ان کے فعل کو وہ ناپسندیدہ نگاہ سے نہ دیکھتے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ خَرَقَهَا سے مراد صرف اسی قدر ہو کہ اس کے توڑنے کا حکم دے دیا۔ کیونکہ اگر فی الواقع توڑ دی ہوتی تو لوگ غرق بھی ہو جاتے۔اور ایسا ہی غلام کے قتل کرنے میں بھی ممکن ہے مراد صرف اس کے قتل کا حکم ہو۔ ایسے موقعہ پر اس قسم کے الفاظ کا بول دینا عام محاورہ ہے۔اور یہاں بہر حال کشتی کو صرف عیب دار کر دیا ہے بالکل نہیں توڑا جیسا کہ [آیت:79] سے ظاہر ہے۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۷۲﴾

کہا کیا میں نے تجھے نہیں کہا تھا کہ تو میرے ساتھ صبر نہیں کر سکے گا۔

قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَ لَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ﴿۷۳﴾

(موسیٰ نے) کہا آپ گرفت نہ کیجیے جو میں بھول گیا اور میرے معاملہ میں مجھ پر تنگی نہ ڈالیے۔

فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ؕ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا ﴿۷۴﴾

پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب ایک جوان سے ملے تو اس نے اسے قتل کر دیا (موسیٰ نے) کہا کیا تو نے ایک بے گناہ جان کو بغیر جان کے (بدلہ کے) مار ڈالا یقیناً تو نے بہت بری بات کی۔ (1947)

1947 - غُلَامٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 416] پیدا ہونے سے لے کر جوانی تک غلام کہا جاتا ہے اور کَھْل کو بھی غلام کہہ دیتے ہیں اور یہاں بعض نے نابالغ قرار دیا ہے بعض نے بالغ۔ (ر)

زَكَا۔ زَكِيَّةٌ۔ زَكٰوةٌ۔ زَكِيَّةً۔ زَكَاءٌ کے اصل معنی ہیں بڑھانا اور [اَرْضٌ زَكِيَّةٌ] اچھی زمین کو کہتے ہیں۔ اور آگے آتا ہے ﴿خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً﴾ [81] جہاں زکوٰۃ کے معنی صلاح ہیں اور یہی معنی ﴿حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ زَكٰوةً﴾ [مریم: 13:19] ''اپنے پاس سے رحمدلی اور پاکیزگی (دی تھی)۔'' میں ہیں اور آیت 81 میں زکوٰۃ کے معنی عمل صالح بھی کیے گئے ہیں۔ جیسے ﴿لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ﴾ [المؤمنون: 4:23] ''پاکیزگی کے لیے کام کرنے والے ہیں۔'' میں (ل) پس زَكِيَّةً کے معنی ہوں گے اچھا بھلا۔ اور مفسرین نے اس کے معنی تَائِبَةٌ یعنی توبہ کرنے والا اور مُسْلِمَةٌ یعنی فرمانبردار کیے ہیں۔ (ج)

﴿نُكْرًا﴾۔ نُكْرٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 1481] وغیرہ۔ اور نُكْرٌ بڑے سخت امر کو کہتے ہیں جو پہچانا نہیں جاتا۔ (غ)

خضر علیہ السلام کا ایک شخص کو قتل کر دینا:

یہ دوسرا واقعہ ہے اور گو مفسرین نے عموماً اسے بچہ قرار دیا ہے اس وجہ پر کہ اسے زَكِيَّةً کہا گیا ہے۔ لیکن اگر زَكِيَّةً کے معنی بے گناہ بھی لیے جائیں تو مراد صرف اس قدر ہوگی کہ اس نے کوئی ایسا گناہ نہ کیا تھا جس کی وجہ سے اسے قتل کیا جاتا۔ چنانچہ ﴿بِغَيْرِ نَفْسٍ﴾ اسی لیے بڑھایا ہے کہ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا تھا اور یہ نابالغ بچہ نہ تھا بلکہ جوان تھا۔ کیونکہ سزائے قتل بلوغت پر ہی وارد کی جاتی ہے۔ جب سے دنیا پیدا ہوئی کسی شخص نے خواہ نبی ہو یا رسول بچوں کو اس لیے قتل نہیں کیا کہ یہ بڑے ہو کر گنہگار ہو جائیں گے۔ اگر یہ بھی کوئی قانون ہوتا تو پھر چاہیے یوں تھا کہ جتنے گنہگار ہونے والے ہوتے اللہ تعالیٰ انہیں بچپن میں ہی خود مار دیا کرتا یا کم سے کم کسی نبی کے وقت میں ہی اسے اطلاع دے دیا کرتا کہ فلاں بچہ گنہگار ہوگا اسے قتل کر دو۔